احادیث اور معاشرہ

راجا رشید محمود

اختر کتاب گھر

اظہر منزل۔ نیو شالامار کالونی۔ ملتان روڈ۔ لاہور، ۲۵

احادیث اور معاشرہ

راجا رشید محمود

اختر کتاب گھر

اظہر منزل۔ نیو شالامار کالونی۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

کتاب : احادیث اور معاشرہ
موضوع : احادیث کی تشریح
شارح : راجا رشید محمود (ایم اے۔ فاضل درس نظامی)
خوشنویس : خلیل احمد نوری
اشاعتِ اوّل : ۱۹۸۶ء
صفحات : ۱۶۰
مطبع : امید پرنٹرز 16 دربار مارکیٹ لاہور
ناشر : اختر کتاب گھر، لاہور
قیمت
۱۸ روپے

دو باتیں

حُسنِ معاشرت اسلامی تعلیمات کا تخصص ہے۔ خدا اور رسول خدا (جل شانہ وصلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں یہی حکم دیا تھا کہ ہم ایک پُرسکون معاشرہ تعمیر کریں جس میں دشمنیاں، مخالفتیں، مخاصمتیں اور شکر رنجیاں نہ ہوں، اُخوّت و مروّت، اخلاص و ایثار اور عفو و درگزر کا دور دورہ ہو مسلمان محبت کے سائبان تلے طمانیت کی زندگی گزاریں اور رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ کی تصویر بن جائیں۔

ہم نے پاکستان اس دعوے کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ یہاں کلمۂ طیبہ کی حکمرانی ہو گی، یہاں لوگ اسلام کی برکات سے متمتع اور مستفید ہوں گے — لیکن ہوا کیا؟ ایک مثالی اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کا موقع ہوتے ہوئے ہم نے رذائلِ اخلاق کو اپنا لیا، ہم اپنے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء کے ارشادات سے دور ہٹتے گئے، جس کے نتیجے میں سکون و عافیت سے خالی معاشرے کے مفلوج اعضا و جوارح بن کر رہ گئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اسلامی معاشری اقدار کی اہمیت پھر سے ہمارے اذہان و قلوب میں راسخ ہو جائے۔ ہم جان لیں کہ اگر کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں، کسی کا حق مارتے ہیں یا ماحول کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں بے دلی اور بے اطمینانی کی ہلچل پیدا کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں تو ہمارا اسلام کا دعویٰ محض زبانی ہے۔

اصلاح معاشرہ کے حوالے سے حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی بے شمار احادیث میں سے چند کی تشریح کی سعادت اس لیے حاصل کی جا رہی ہے کہ شاید کوئی بات کسی قاری کے دل پر اثر انداز ہو جائے اور سرکار میری اس سعی کو پسند فرما کر مجھے اپنے دربارِ گہربار پہ حاضری کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

قطعہ

دوستو! ہر کام کا کوئی تو ہوتا ہے سبب
یارو! بے مقصد بھی کرتا دیکھا کوئی بھاگ دوڑ
ہے احادیثِ مقدس کو سمجھنے کا جو ذوق
طلبہ جانے کی تمنا میں ہے ساری بھاگ دوڑ

"احادیث اور معاشرہ" کے بیشتر ابواب ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئے

فہرست

محبوبِ کبریا (علیہ التحیۃ والثنا) کے اسمائے گرامی

عن ابی موسی الاشعری قال کان رسول اللّٰہ علیہ وسلم یسمی لنا نفسہ اسماء فقال انا محمد واحمد والمقفی والحاشر ونبیُّ التوبۃ و نبی الرحمۃ

مسلم شریف کی یہ حدیث پاک مشکوٰۃ المصابیح میں نقل کی گئی ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے اپنے یہ نام بیان فرمائے۔ فرمایا، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں مقفی ہوں، میں حاشر ہوں، میں نبیِ توبہ ہوں، میں نبیِ رحمت ہوں۔

حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے اس حدیث پاک میں اپنے چند نام ارشاد فرمائے۔ فرمایا، میں محمد ہوں۔ یعنی بہت ہی زیادہ تعریف کیئے گئے، بے اندازہ عمدہ خصلتوں والے۔ خداوند تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذکر اس نام سے بھی کیا ہے، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ اسی طرح آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نام

احمد بتایا۔ اس کا مادہ بھی ح م د ہے۔ قرآن مجید میں ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارت دی اور فرمایا اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ "میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوا، اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے، ان کا نام احمد ہے۔"

سورہ صف میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اس بشارت کی تفسیر میں، بخاری شریف میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ معظم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرے کتنے ہی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ اللہ تعالٰی کفر کو میرے ذریعے مٹا دے گا اور میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں میں اکٹھا کیا جائے گا۔ اور میں عاقب یعنی سب سے آخری نبی ہوں۔

اپنے اسم مبارک "احمد" کے بعد زیرِ نظر حدیث پاک میں حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، میں مقفّی ہوں۔ یہ اسم فاعل ہو تو معنی ہے، سب نبیوں کے بعد دنیا میں تشریف لانے والے۔ اور اسمِ مفعول ہو، مقفّٰی، تو مطلب ہے، سب نبیوں، تمام انسانوں اور ساری مخلوق سے آگے رہنے والے۔ کہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پہ چلنے والے ہیں۔

حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنا اسم گرامی "حاشر" بھی فرمایا۔ یعنی سب کو حضور کے قدموں میں اکٹھا کیا جائے گا۔ حشر کے دن پہلے سرکارِ

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے، بعد میں سب لوگ اٹھائے جائیں گے اور جمع ہوں گے۔

پھر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی توبہ اور نبی رحمت فرمایا۔ آپ نبی توبہ یوں ہیں کہ آپ کے دین میں توبہ آسان کر دی گئی اور توبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بہت مقبول ہوئی۔ اگلی امتوں کے قصور اور جرائم سزا کے بغیر معاف نہ کیے جاتے تھے لیکن امت مسلمہ کے لیے خداوند کریم جل شانہٗ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا (النساء، ۶۴) "اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں۔ پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں" ——— یعنی مسلمانوں میں سے کوئی اگر غلطی کر بیٹھے، اس سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو وہ توبہ کرے اور توبہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ "جَآءُوْكَ" آپ کے حضور حاضر ہوں۔ پھر اللہ سے معافی چاہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شفاعت فرمائیں تو اللہ تعالٰی توبہ قبول فرمائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لیے یہ رعایت ہو گی کہ کوئی سزا دیے بغیر مجرم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔

نبی توبہ کے ساتھ ساتھ سرکار نبی رحمت بھی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمومی رحمت تو سب دنیاؤں کے لیے ہے۔ سورہ انبیاء میں ارشاد خداوندی ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ "اور ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔" اس طرح حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام سب جہانوں کے لیے نبیِ رحمت ہیں اور بطورِ خاص مسلمانوں کے لیے یوں نبیِ رحمت ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے: بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہر لحاظ سے جامع اور آپ کی صفات ہر طرح سے ارفع ہیں۔ حضورؐ کا ہر عمل انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ آقا کا کردار ہمارے لیے نمونہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کا ہر لمحہ ہمارے لیے مینارۂ نور ہے۔ مختلف کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صفاتی نام آتے ہیں۔ احادیث کی مختلف کتابوں میں بھی حضورؐ کے بہت سے نام ہیں۔ خود خداوند قدوس وکریم نے قرآن کریم میں بہت سے ناموں سے ان کا ذکر کیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشیر، العروۃ الوثقیٰ، المزکّی، المصدّق کہا گیا ہے۔ خوشخبری سنانے والے، اللہ پر یقینِ کامل رکھنے والے، دلوں کو پاک کرنے والے اور سچ بتانے والے۔ آلِ عمران میں المجتبیٰ، چنے ہوئے برگزیدہ اور المنادی، حق کی آواز بلند کرنے والے کہا گیا ہے۔ سورۂ نساء میں انہیں البرہان، حکم اور حاکم اور المطاع کہا گیا ہے یعنی اللہ کی دلیل اور حجت، انصاف فرمانے والے اور جن کی اطاعت کی گئی۔ سورۂ مائدہ میں انہیں نور فرمایا گیا۔ سورۂ اعراف میں الآمر والناہی یعنی نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے کہا گیا ہے۔ سورۂ توبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کا خیال رکھنے والے، غمگسار، رؤف، رحیم، جہاد کرنے والے اور بشارت دینے والے فرمایا گیا۔ سورۂ رعد میں مُنذِر کہا گیا کہ وہ لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی مختلف سورتوں

میں انہیں مختلف نام عطا کیے گئے جن میں سے چند یہ ہیں، خاتم النبیین، روشن چراغ، ہدایت دینے والے، امین فاتح، صاحبِ حکمت و فراست بے مثال اخلاق والے، صاحبِ قوت اور لوگوں پر اللہ کی دلیل اور حجت، ——— وغیرہ۔

اصل میں حضور فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ ہر نیکی کا منبع و مصدر ہیں۔ ان کی پاک زندگی کا ایک ایک لمحہ نور کا روشن مینار ہے۔ یہاں کسی خامی، کسی عیب کا تصور تک نہیں۔ مشہور نعت گو صحابی حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا،

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ\
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

(حضورؐ! آپ تو ہر عیب سے مبرّا ہیں\
کہ جیسے آپ نے چاہا، خدا نے پیدا کیا) ترجمہ منیر قصوری

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے عیب حیاتِ پاک کے ہر لمحے کو کوئی اچھا نام دیا جا سکتا ہے۔ کوئی اچھائی ایسی نہیں جو حضورؐ کی زندگی میں نہ ہو۔ دین و دنیا میں بہتری کے لیے آپ ہی کی زندگی سے رہنمائی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ آپ نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن، اپنی جوانی اور اس کے بعد ساری زندگی جس ماحول میں بسر کی، اس کی برائیوں کو ختم کر کے دم لیا۔ دنیا بھر کی بدی کے خلاف جہاد کیا، دنیا کو سیدھی راہ دکھائی۔ وہ اشجع الناس تھے، دنیا میں سب سے بہادر، وہ افصح العرب تھے کہ عرب میں بھی ان جیسا فصیح و بلیغ پیدا نہ ہوا، باقی دنیا میں تو کیا ہوتا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی گزارنے کے آداب سکھائے ہیں، ہمیں حکومت

کرنا سکھایا ہے۔ ہمیں معاشرت یعنی رہن سہن کے طریقے سمجھائے ہیں، ہمیں خدائے قدوس کے آگے جھکنا سکھایا ہے۔ ہمیں ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ حضور خیر الانام ہیں، محسنِ کائنات ہیں، سرورِ دوراں ہیں، محبوبِ دو عالم ہیں، محبوبِ ربِّ دو عالم ہیں، مطلعِ کائنات ہیں، مقطعِ انبیاء ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخاری شریف کی زبان میں سب سے زیادہ سخی ہیں، اللہ کی ذات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، سچ کہنے والے ہیں، تقسیم کرنے والے ہیں، کفر و شرک کو مٹانے والے ہیں، مومنوں کے آقا ہیں، بے آسرا لوگوں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ مسلم شریف کی احادیث کی رُو سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم امانت دار ہیں، تمام انسانوں کے سردار ہیں، بارگاہِ خداوندی میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہیں اور سب سے پہلے انہی کی شفاعت قبول ہوگی۔ ابنِ ماجہ شریف کے مطابق امام الخیر ہیں، بھلائی کی طرف لے جانے والے پیشوا۔ مفتوح ہیں، عفو و درگزر کرنے والے معلّم ہیں، نیکی اور اچھائی کی تعلیم دینے والے۔ ترمذی شریف میں آپ کے نام اکرم اور مدینۃ العلم ہیں، سب سے بڑھ کر کرم کرنے والے اور علم کا شہر۔

غرض، حضور محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء کے بہت سے نام قرآن و احادیث میں مذکور ہیں۔ زیرِ نظر حدیث پاک کے مطابق آپ نے فرمایا میں محمد ہوں، احمد ہوں، سب نبیوں کے بعد آیا ہوں، ساری مخلوق سے پہلے پیدا کیا گیا ہوں، حشر کے دن سب میرے پیچھے آئیں گے اور انہیں میرے قدموں میں جمع کیا جائے گا۔ میری وجہ سے توبہ آسان ہوگئی ہے اور میں انسانوں کے لیے رحمت ہوں اور مومنوں کے لیے رؤف و رحیم ہوں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

اسلامی بھائی چارے کی برکات

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یُسْلِمُہٗ وَمَنْ کَانَ فِیْ حَاجَۃِ اَخِیْہِ کَانَ اللّٰہُ فِیْ حَاجَتِہٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ کُرْبَۃً فَرَّجَ اللّٰہُ عَنْہُ کُرْبَۃً مِّنْ کُرُبَاتِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَمَنْ سَتَرَ عَنْ سَتَرَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (متفق علیہ)

بے شک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے ذلیل کرے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے، اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت پوری کرے گا۔ اور جو آدمی کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی تکالیف میں سے ہر تکلیف سے بچائے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

حضور فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے سب سے پہلے اسلامی اخوّت کی نشان دہی فرمائی کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ یہاں غیریت اور

بیگانگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب خالق و مالکِ حقیقی اور اس کے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھے اور آپ کو بھائی بھائی قرار دے دیا تو پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی کیوں نہ ہوں گے۔ میری راحت سے آپ کو مسرت کیوں نہ ہوگی اور آپ کی تکلیف مجھے رنجیدہ کیوں نہ کرے گی، میں کسی پریشانی میں مبتلا ہوں گا تو آپ اس دکھ میں اپنے آپ کو بھی نہ صرف شریک پائیں گے بلکہ اس پریشانی سے نجات کے لیے تگ و دو بھی کریں گے۔ اس طرح ہم دونوں، پھر پورا معاشرہ محبت کی سچی تصویر بن جائے گا۔ اور ایک مسلمان پوری دنیائے اسلام کے رشتۂ مودّت واخوّت کا گراں قدر موتی ہوگا۔

حضور محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثناء نے رشتۂ اخوّت کو یاد دلا کر، اس رشتے کی مقتضیات کو بھی واضح طور پہ بیان فرما دیا۔ حکم دے دیا کہ مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی پر نہ ظلم کرے اور نہ اُسے ذلیل و رسوا کرے۔ مقصد یہ ہے کہ جو آدمی اپنے کسی مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے یا اسے ذلیل کرتا ہے، وہ خدا اور رسولِ خدا (جل وعلا و صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور چونکہ سرکارؐ نے مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دے کر اسے یہ حکم دیا ہے اس لیے اس کی خلاف ورزی کرنے والا، اپنے مسلمان بھائی پہ ظلم کرنے والا یا اسے ذلیل و رسوا کرنے والا دائرۂ اسلام سے تجاوز کرنے والا ٹھہرا۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان بھائیوں کے حقوق متعین فرما دیے۔ یہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اسے رسوا نہ کرے۔ ساتھ ہی حضور محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنے مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت پوری کرے گا اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کی کوئی تکلیف رفع کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی تکلیف

سے محفوظ کر دے گا۔ اور جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کا اہتمام کرے، اللہ کریم قیامت کے دن اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرے گا۔

جب ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہو اور ایک عالمی برادری کے رشتے میں منسلک ہو۔ اور اس ناتے سے کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم نہ کرتا ہو اور اس کی ذلت و رسوائی کا سبب نہ بنتا ہو تو معاشرے میں محبت واخوت کی جو مثالی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، اس میں ہر شخص دوسرے کا احساس کرتا ہے اور دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ ایسے میں جب کوئی ایک مسلمان دوسرے بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے تو دوسرا بھائی بھی اس کی ہر حاجت پوری کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کی مدد کرنے کی کیفیت تو مستقل ہوتی ہی ہے لیکن اس باہمی اشتراک و تعاون اور مودّت کے نتیجے میں خدا تعالیٰ بھی ان دونوں کی مدد فرماتا ہے اور ایک دوسرے کی حاجت پوری کرنے والے اہلِ اسلام کی حاجتیں خود پوری فرماتا ہے اور جب یہ ذمہ خود خدائے پاک اٹھا لیتا ہے تو کوئی حاجت پوری نہ ہونے کا کیا سوال رہ سکتا ہے۔

اسی طرح حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب ایک مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کی تکلیف دور کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے تو گویا اپنے لیے اس بات کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے کہ داورِ محشر قیامت کی تکالیف اس کے لیے آسان فرما دے۔ اسلامی معاشرے میں ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، ایک دوسرے کی تکلیف دور کرنے کی سعی کرتے ہیں تو اس طرح جہاں ایک پُرسکون معاشرہ قائم کرتے ہیں، وہاں ہمیں آپس میں ایک دوسرے کی امداد کرتے دیکھ کر اللہ کریم یوں خوش ہوتا ہے کہ قیامت کے

دن ہماری تکالیف راحت میں بدل دیتا ہے۔

پھر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں جو آدمی دوسرے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ دنیا میں جب ایک مسلمان دوسرے کی پردہ پوشی کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرا نہ صرف یہ کہ ایسے کسی موقع پر اس کی پردہ پوشی کرے گا بلکہ دوسرے معاملات میں بھی آپس میں محبت بڑھے گی اور ایک دوسرے کے ساتھ ایثار و تعاون کی فضا قائم ہوگی۔ لیکن آپس میں شریف آدمیوں کی طرح رہنے کا سب سے بڑا اور اصل فائدہ یہ ہے کہ خدائے علیم و خبیر قیامت کو اس کی پردہ پوشی کرے گا جو اپنے دوسرے بھائی کی پردہ پوشی کی نیکی کر چکا ہے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنایا کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہے جو میری وجہ سے آپس میں محبت کریں۔

اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے ہمیں جو حکم فرمایا ہے، اس پر عملدرآمد دنیا و آخرت میں ہماری فلاح کا ضامن ہے۔ اور ہمارا یہ عقیدہ اگرچہ "یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ" ہی کی بنیاد پر قائم ہے لیکن اسلام کے ہر حکم کی اساس ایسی ہے کہ ہم ذرا غور و فکر کریں اور "تتدبروا" اور "تتفکروا" کی الوہی ہدایت پر عمل کریں، سوچیں سمجھیں تو ہمارے دماغ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا، ہمیں خود ہر حکم خدا اور رسولؐ خدا کے اچھے نتائج نظر آسکتے ہیں۔

زیرِ نظر حدیث پاک پر عمل کرتے ہوئے اگر ہم آپس میں بھائی بھائی بن جائیں، ہماری اس اخوت کا دائرہ گفتار سے کردار تک وسیع ہو جائے تو لابدی ہو گیا کہ پورے مسلم معاشرے میں کوئی ایک بھی کسی دوسرے پر نہ ظلم کرے گا،

نہ اس کو ذلیل و رسوا کرنے کا ارتکاب کرے گا۔ ہر مسلمان دوسرے کی حاجت پوری کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دے گا۔ دوسرے کی تکلیف رفع کرنے کے لیے اپنی سی کرے گا اور دوسرے کی پردہ پوشی کا اہتمام کرے گا۔ اس طرح ہماری دنیا تو جنّت نظیر ہو ہی جائے گی، خود خدا تعالیٰ ہماری حاجتیں پوری فرمائے گا، قیامت کے دن ہمیں تکالیف سے نجات دے گا اور ہماری پردہ پوشی فرمائے گا۔ اسلام کے قربان جائیے کہ ہم دنیوی لحاظ سے شرافتوں کو اپنا لیں، ایک دوسرے کے کام آئیں تو در اصل ہم اپنے خالق و مالک کو اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوش کر رہے ہوتے ہیں۔

اسلام زندہ باد!

بھائی کی بھائی سے علیحدگی

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلَاثٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ (صحیح بخاری۔ کتاب الادب)

معاشرہ افراد کے میل جول سے عبارت ہے۔ میں اور آپ الگ الگ ہیں تو اکیلے ہیں، تنہا ہیں، بے یار و مددگار ہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جب دونوں اتحادِ فکر و عمل کی کیفیت کے باعث ایک ہو گئے تو اکیلے اور تنہا نہیں رہے، ایک دوسرے کے یاور و معین بن گئے اور دوسروں کی نگاہ میں وقیع ہو گئے۔ پھر اسلام نے تو مجھے اور آپ کو بھائی چارے کی مضبوط رسّی میں پرو دیا ہے۔ ہم محض دو انسان نہیں، بلکہ مسلمان ہونے کے ناتے ایک دوسرے کے بھائی بھی ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے دکھ درد کا ساتھی اور مسرت و انبساط کا ساتھی ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی مصیبت میں پھنس گیا تو دوسرا بھائی اسے اس مصیبت سے نجات دلانے کی تدبیر بھی کرے گا اور اس کا دکھ بٹائے گا بھی۔ میری خوشی نے میرے مسلم بھائی کو مسرتوں سے ہمکنار کر دیا اور میرے بھائی کے

رنج نے مجھے رنجیدہ کر دیا ـــــــ اگر پورے معاشرے کو اپنائیت کی اس کیفیت نے گھیرے میں لے لیا تو اندازہ فرمائیے، کتنا مثالی معاشرہ تشکیل پائے گا ـــــــ یہی ہمارے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء کی رضا ہے۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے منع فرمایا کہ اس سے آپس کے تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں، معاشرے میں محبت و رواداری کا عمل دخل کم ہو جاتا ہے اور دلوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ حضور پُرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، حسد کرنے والا ہم سے نہیں ہے ـــــــ کہ اس مرض سے دل ایک نہیں رہتے، حُسنِ معاشرت کا اسلامی نصب العین مجروح ہوتا ہے۔ سرکارِ والا تبار نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے کام آنے کی تلقین فرمائی ہے۔ فرمایا کہ جس کا ہمسایہ بھوکا سویا وہ جنتی نہیں، کسی کا حق کھانے والا دوزخ کا حقدار ہے۔ خدا اور رسولِ خدا (جل وعلا و صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہلِ اسلام کے معاشرے کو مثالی معاشرہ بنانے کے لیے ہی سینکڑوں احکام دیے۔ ارتکازِ و اکتنازِ زر پر ہمیں سخت وعیدیں دی ہیں، گردشِ دولت کے طریقے بتائے ہیں، غرباء و مساکین کو اوپر اٹھانے کے لیے دولتمندوں کو خرچ کرنے اور خرچ کرتے رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ دولت کمانے کی حدود مقرر فرمائی ہیں تاکہ دولتمندی میں بھی حد ہے۔ یہ سب کچھ حُسنِ معاشرت کی تشکیل کی خاطر کیا گیا تاکہ طبقات جنم نہ لیں۔ افراد اور گروہوں میں دوریاں پیدا نہ ہوں، محبت بڑھے، خلوص پنپے اور ایثار جگہ پائے۔ اسلام نے ہدایت کی کہ کوئی فرد کسی دوسرے کو ظلم اور زیادتی کا نشانہ نہ بنائے کہ اس سے معاشرے کا سکون برباد ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی زیادتی کر بیٹھے تو اس کو اس کے بدلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ دوسری طرف جس پر ظلم ہوا ہے، اس کے لیے یہ بہتر قرار دیا کہ وہ غصہ پی لے اور معاف کر دے

تو وہ اللہ کے نزدیک "مومن" ہے اور اس کا محبوب بھی۔

جہاں افراد رہتے ہیں، وہاں ان کے درمیان شکر رنجیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مثالی معاشرے میں بھی یہ صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ہے کہ ایسی صورت پیش آ جائے تو ہمیں کیا کرنا ہے۔ آقا حضورؐ نے فرمایا کہ اگر ہم صاحبِ ایمان ہیں تو ہمارے لیے کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے مسلمان بھائی سے، تین دن سے زیادہ اس انداز میں علیحدگی اختیار کریں کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لیں۔ سرکارؐ نے ہمیں اخوتِ اسلامی کے عظیم جذبے سے سرشار فرمایا، اس لیے یہ بھی فرما دیا کہ کسی شکر رنجی کی صورت میں اس کو دوام نہ دیں، اسے جلد از جلد ختم کر دیں۔ آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان ہونے کی خصوصیت یہ بتائی کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے اور فرمایا کہ ان میں سے تعلقات بحال کرنے کی غرض سے سلام میں پہل کرنے والا بہتر ہے۔

اگر ہم ایک اسلامی معاشرے کے فرد ہیں، اگر ہمیں خدا اور رسولِ خدا کے احکام و ارشادات کی اہمیت کا احساس ہے، اگر ہمیں معلوم ہے کہ ان کے احکام و ہدایات پر عملدرآمد نہ کرنے سے ہم دنیا و عاقبت کو برباد کر لیں گے —— تو ہمیں ایسے عوامل و محرکات سے بچنا ہوگا جن کے باعث ایک دوسرے سے قطع تعلقات کی نوبت آئے۔ اگر کسی وجہ سے ایسی صورت پیش آ جائے تو یاد رکھنا ہوگا کہ تین دن سے زیادہ علیحدہ رہنا ہمارے لیے جائز نہیں اور جب بالآخر ملنا ہی ہے تو سلام میں پہل کر کے خدا اور رسولِ خدا کی نظر میں اچھا بننے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنے جن اعزہ و اقربا سے ملتے رہتے ہیں، ان سے

محبت بڑھتی ہے۔ جن سے میل ملاپ کم ہو جائے، ان سے محبت بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں دوستوں سے، رشتہ داروں کی نسبت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی سے کسی وجہ سے ناراض ہو گئے تو انسانی جبلت یہ ہے کہ پہلے جس شخص سے صاحب سلامت تھی، اس سے قطعِ تعلق پر بھی، کم سے کم تین دن تک اس کی باتیں یاد آتی رہتی ہیں، اس کا خیال ستاتا رہتا ہے، اگر تین دن سے بات بڑھ جائے تو اس قطعِ تعلق کو دوام بھی ہو سکتا ہے —— اور یہی ہمارے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں۔

پھر آدمی کی "انا" اسے دوسرے کے آگے جھکنے سے روکتی ہے۔ ہمارے آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء نے تعلقات بحال کرنے میں پہل کرنے والے کو بلند مرتبہ دینے کی تشویق کے ذریعے "قطعِ تعلق" کی کیفیتوں کو ختم کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "انا" معاشرے میں بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ آقا حضورؐ نے حسنِ معاشرت کی راہ میں حائل اس رکاوٹ کو دور فرما دیا۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک دو مسلمانوں کا ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لینا سخت ناپسندیدہ ہے اور حضورؐ نے اسے مسلمان کے لیے درست قرار نہیں دیا۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، وہ ایک دوسرے سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہی اچھے لگتے ہیں۔

—— ہمیں سرکارؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں اپنے کردار کا جائزہ لینا ہوگا کہ کہیں ہم اپنے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ یہ سلوک تو نہیں کرتے کہ اس سے ناراض ہو جائیں، پھر وہ ناراضی تین دن سے تجاوز تو نہیں کر جاتی۔ اگر ناراضی ہو جائے تو سلام میں پہل کر کے اپنے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کون کرتا ہے۔

ایمان کی کاملیت کا نشان

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (سننِ ابی داؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح پر بہت زور دیا ہے۔ بلکہ مؤطا امام مالک اور مسند امام احمد میں ہے کہ سرکار نے فرمایا: میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں۔ یعنی فروغِ اخلاق تو بعثتِ محمدی کا مقصدِ خاص ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اخلاق کے فروغ کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔

اسلام کا بنیادی مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے جو مثالی معاشرہ مطلوب ہے، اس میں ہر شخص دوسرے ساتھی کا نیک خواہ ہو گا، کوئی کسی کے خلاف سازش نہیں کرے گا، کسی کا حق غصب نہیں ہو گا بلکہ اسلام نے مسلمان بھائی کے جو حقوق مختلف حیثیتوں میں متعین کیے ہیں، وہ پورے کیے

جائیں گے۔ اولاد کے ماں باپ پر اور والدین کے اپنی اولاد پر حقوق ہیں، ہمسایوں کے حقوق ہیں، عُسرت زدوں اور بے ثروت مسلمانوں کے حقوق ہیں، قرابت داروں کے حقوق ہیں، مسافروں کے حقوق ہیں —— غرضیکہ ہر حیثیت میں انسان کے جو حقوق خدا تعالیٰ نے متعین فرمائے ہیں، وہ اسلامی معاشرے میں پورے کیے جائیں گے۔ اور ان سب حقوق اور دوسری حیثیت میں فرائض کی بنیاد حُسنِ اخلاق پر قائم ہے۔ یعنی اولاد کے حقوق ماں باپ کے فرائض ہیں، عزیزوں کے حقوق امیروں اور ثروت مندوں کے فرائض ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

اسلام نے ہمیں زندگی گزارنے کے آداب سکھائے ہیں، زندگی کے مختلف شعبوں میں رہنمائی کی ہے۔ ہمیں بتایا ہے کہ تعلیم کیا حاصل کرنی ہے اور کس قدر، معاشرتی انداز میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ ہماری معیشت کا نظام کیسا ہو۔ ہمیں حکومت کیسے کرنا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے اور اسلام کا ہر شعبہ دوسرے شعبے کے ساتھ منسلک و مربوط ہے۔ مسلمانوں کا نظامِ سیاست و حکومت اس کے نظامِ معیشت یا نظامِ معاشرت سے الگ نہیں بلکہ اگر آپ انہیں الگ کرنا چاہیں تو یہ نظام مناسب برگ و بار ہی نہیں دیتے۔ اسلام کے ہر نظام کی بنیاد اس کا نظامِ اخلاق ہے۔ ہماری معیشتی اُستواری کی اساس بھی اخلاق ہی پر قائم ہے۔ ہماری معاشرت تو تمام تر اخلاقی بندھنوں میں اس طرح مقید ہے کہ اس سے زیادہ آزادی کا احساس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم راعی ہیں تو اخلاق کے اصولوں کے تابع ہیں، رعایا ہیں تو بھی ہمارے تمام تر رویے اخلاق ہی کے دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان والوں میں زیادہ کامل اہلِ ایمان وہ ہیں جو اخلاق میں زیادہ

اچھے ہیں۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضور پُرنور
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ
اچھے ہیں۔ جب اسلام دنیا میں اخلاق ہی کا فروغ چاہتا ہے، جب سرکارِ دوجہاں
صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہی بیان کیا گیا ہے، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے
کہ معلم کائنات کے اوّلین متعلم اخلاق لحاظ سے (نعوذ باللہ) اچھے نہ ہوں۔ پھر بھی
آقا حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی ایسی بہترین کھیپ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم) میں
سے بھی جن حضرات کا اخلاق نسبتاً زیادہ اچھا ہوگا، وہ دوسروں سے بہتر ہیں۔

حضور رسولِ انام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہی اخلاق کے فروغ کے
لیے تھی۔ ان کے لیے تو خالق و مالکِ حقیقی جل جلالہٗ نے فرمادیا اِنَّکَ لَعَلٰی
خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۴) سرکارؐ کا خلق سب سے عظیم تھا اور اس عظمت کا
اعلان خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اس کے باوجود اُمت کی تعلیم کی خاطر اور اخلاق
کی اہمیت کے بیان کے لیے سرکارؐ دعا کیا کرتے تھے (اُم المؤمنین حضرت عائشہ
صدیقہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں) "اَللّٰھُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ
خُلُقِیْ" (مسند امام احمد) "اے اللہ! تو نے اپنے کرم سے میرے جسم کی ظاہری
بناوٹ اچھی بنائی ہے، اسی طرح میرے اخلاق بھی اچھے کردے۔" اس کا مفہوم
یہ بھی ہے کہ جسم کی خوبصورتی اور اچھی ظاہری بناوٹ کی اتنی اہمیت نہیں ہے
جتنی بہتر اخلاق کی ہے۔ اور ہر خوبصورت اور جامہ زیب آدمی کو اپنے اخلاق بہتر
سے بہتر کرنے چاہئیں اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس کے اخلاق کو بہتر
کردے ۔۔۔ کہ اُس کی توفیق کے بغیر یہ مقام رفیع پایا نہیں جا سکتا۔

سننِ ابی داؤد اور جامع ترمذی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن مومن
کی میزانِ عمل میں سب سے زیادہ بھاری چیز اچھے اخلاق ہوں گے۔ بیہقی میں
ہے، بعض صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)، انسان کو جو
کچھ عطا ہوا ہے اُس میں سب سے بہتر کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "اچھے
اخلاق"۔ معلوم ہوا کہ انسان کے لیے خداوند کریم کی نعمتِ عظمیٰ خوش خلقی ہے۔
اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو بے انتہا نعمتیں بنی نوعِ انسان کو دی ہیں اور جو کرم اس
پر فرمائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نعمت اچھے اخلاق ہیں۔ جو آدمی اس
نعمت سے نوازا گیا ہے، وہ اپنی خوش قسمتی کو محسوس کرتے ہوئے خدا کا شکر
ادا کرے اور دوسرے لوگ اس کے مقدر پر رشک کریں کہ اسے اتنا بڑا اعزاز
نصیب ہوا ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ قیامت
کے دن مومن کی فردِ عمل میں سب سے اہم اور قیمتی اور بھاری چیز اس کے بہتر
اخلاق ہوں گے۔ جو صاحبِ ایمان جتنا زیادہ خوش خُلق ہوگا، اسی قدر زیادہ
اسے اجر ملے گا کہ مومن کی میزانِ عمل کی سب سے وزنی چیز یہی ہوگی۔

اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کائنات کے سرور صلی اللہ علیہ وسلم
کا ارشادِ مبارک بتاتی ہیں کہ مومن اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے قائم اللیل اور
صائم النہار لوگوں کا درجہ پالیتا ہے (ابوداؤد) یعنی وہ لوگ جو ساری ساری
عبادت کرتے ہیں اور دن کو ہمیشہ روزے سے رہتے ہیں، ان کا درجہ وہ
شخص حاصل کر لیتا ہے جو صاحبِ ایمان ہو اور اس کے اخلاق اچھے ہوں۔
اس حدیثِ پاک سے واضح ہوتا ہے کہ بندے کا مومن ہونا شرطِ اوّل ہے۔
ایک صاحبِ ایمان اپنے حُسنِ اخلاق کے باعث وہ درجہ پالیتا ہے جو شب بیدار
عابد اور صائم النہار متقی کو ملتا ہے۔ اس سے حُسنِ اخلاق کی اہمیت کا اندازہ

ہوتا ہے۔

اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کا وجود لوگوں کے لیے رحمت کا باعث ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ جو جو شخص اس سے ملتا ہے، جس جس آدمی سے اس کا رابطہ ہوتا ہے، وہ راحت محسوس کرتا ہے۔ حُسنِ اخلاق کے حامل آدمی کی اپنی زندگی میں بھی سکون و طمانیت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس طرح پورے ماحول پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن کسی ماحول میں ایک بھی بدخُلق شخص موجود ہو تو وہ جو غالب نے کہا تھا:

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات، اس نے شکایت ضرور کی

ایسے بد اخلاق آدمی سے جس جس شخص کا واسطہ پڑتا ہے، وہ پریشان ہو جاتا ہے، اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ماحول پر تکدر سایہ کناں ہو جاتا ہے اور خود وہ بد اخلاق آدمی اپنے آپ سے بھی جلا بھنا رہتا ہے، اس کی زندگی بھی مسرت و سکون سے محروم ہوتی ہے۔ اس طرح معاشرے میں بے اطمینانی اور عدم سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے —— اور اخوتِ اسلامی کی صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے حضور فخرِ موجودات باعثِ ظہورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئی احادیث میں اخلاق کی اہمیت بیان فرمائی ہے اور مومن کو احساس دلایا ہے کہ ایمان کی بنیادی صفت حُسنِ اخلاق اور خوش خلقی ہے۔ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق کا مالک ہو۔

حُسنِ سلوک کے اوّلین مستحق

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ فَاَدْنَاكَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ ایک شخص نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مجھ پر حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، تمہاری ماں کا، پھر تمہاری ماں کا، پھر تمہاری ماں کا۔ اس کے بعد تمہارے باپ کا۔ اس کے بعد تمہارے قریبی رشتہ داروں کا، پھر جو اُن کے بعد قریبی ہوں۔

صحیحین کی اس حدیثِ پاک میں سوال کرنے والے صحابی کا نام مذکور نہیں لیکن جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد میں ان الفاظ سے قریب قریب الفاظ میں ایک حدیث پاک ہے جس میں سوال کرنے والے معاویہ بن حیدہ قشیری ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدین کے حقوق اور اُن سے متعلق اولاد کے فرائض کے بارے میں کئی احادیثِ مبارکہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ زیرِ نظر حدیثِ پاک میں آقا حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے خدمت اور حُسنِ سلوک کا سب سے پہلا مستحق ماں کو قرار دیا ہے۔ تین مرتبہ ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت کے اعلان کے بعد سرکار نے فرمایا کہ پھر اس کے بعد باپ کے ساتھ، پھر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ، پھر جو اُن کے بعد قریبی ہوں، ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا چاہیے۔ اس لحاظ سے ماں کا درجہ باپ سے بھی بلند تر بتایا گیا ہے۔

ترمذی شریف میں حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ایک ارشادِ پاک کے راوی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ اولاد کے حسنِ سلوک اور خدمت کے اعتبار سے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کو اگرچہ چوتھا درجہ عطا فرمایا، لیکن اولاد کو اس کی اہمیت یوں بتائی کہ اللہ کی رضا مندی والد کی رضا مندی میں ہے — اس سے آدمی خود سوچ سکتا ہے کہ ماں کی ناراضی کی صورت میں اللہ کی ناراضی کتنی بڑھ جاتی ہوگی۔

آج کل معاشرے پر اسلامی اخلاقی اقدار کی گرفت ڈھیل پڑ گئی ہے اور ہمیں اپنے آس پاس ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جو ماں باپ کو ناراض کرنے کا جرم کرتے ہیں یا ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی اُلوہی ہدایت پر عمل کرتے نظر نہیں آتے۔ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں اور کام کاج کے قابل نہ رہیں تو کچھ بدقسمت ان کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے آرام کا اہتمام نہیں کرتے اگر ہم واقعی مسلمان ہیں اور ہمارا خدا اور رسولِ خدا (جل شانہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان ہے، تو اس قسم کی حرکت سے دراصل ہم دوزخ کا ایندھن بنے ہوتے ہیں۔ ابنِ ماجہ میں ہے، سرکار سے پوچھا گیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کتنا حق ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا، وہ تمہاری جنت اور دوزخ ہیں۔ یعنی اگر

والدین کی فرمانبرداری اور خدمت میں مشغول رہو گے، انہیں راضی رکھو گے تو جنت کے حقدار ہو، انہیں ناراض کرو گے، انہیں تکلیف پہنچاؤ گے، ان کے آرام کا خیال نہیں کرو گے، ان کا دل دکھاؤ گے تو جہنم میں جلو گے۔

سننِ نسائی میں معاویہ بن جاہمہ سے روایت ہے کہ حضور حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے ان کے والد سے کہا کہ تمہاری جنت تمہاری ماں کے قدموں میں ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ آدمی ذلیل ہو، خوار ہو، رسوا ہو۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ، کون؟ فرمایا، وہ بدنصیب، جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر جنت نہ پاسکے۔

یعنی جو شخص اپنے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا بڑھاپا پالے ان کی خدمت کی توفیق نہ پائے، انہیں اپنے حسن سلوک اور خدمت سے خوش نہ کرے، گویا وہ بہت بڑا بدقسمت ہے جس کے لیے خود رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذلت و رسوائی مانگ رہے ہیں اس سے کچھ اس گناہ کا اندازہ ہو سکتا ہے جو بڑھاپے میں ماں باپ کی خدمت نہ کرنے والوں سے سرزد ہوتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشادِ خداوندی ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝

اور تیرے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے

ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن سے "ہوں" نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم سے بات کرنا۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ان صریح احکام کی موجودگی میں اگر ہم میں سے کوئی بدقسمت والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا اور ان کے بڑھاپے میں انہیں "اُف" کہتا ہے یا جھڑکتا ہے یا تعظیم سے بات نہیں کرتا، انہیں خوش نہیں رکھتا، ان کے آرام اور سکون کا اہتمام نہیں کرتا —— ان کی ناراضی مول لیتا ہے تو وہ خداوندِ کریم اور اس کے محبوبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سرتابی کا مرتکب ہوتا ہے اور دنیا و آخرت میں اپنی ذلت و رسوائی کو دعوت دیتا ہے۔

اللہ جل جلالہٗ نے سورۂ نساء میں شرک نہ کرنے اور اللہ کی عبادت کرنے کے ساتھ والدین کے ساتھ "احسان" کرنے کی ہدایت فرمائی ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو۔ بخاری شریف کی ایک حدیث پاک جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور دوسری جس کے راوی ابوبکرہ ہیں، دونوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرک کے بعد والدین کی نافرمانی کو سب سے بڑا گناہ فرمایا ہے۔

سورۂ لقمان میں ہے، خداوندِ قدوس و کریم نے حکم دیا اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا، شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔ یہاں بھی خالقِ حقیقی نے انسان کو اللہ کا

اور اپنے والدین کا حق ماننے اور شکر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ پھر ہم کیسے ناشکر گزار ہوں گے، اگر ہم خدا اور رسول کے احکام سے صرفِ نظر کرلیں اور اپنے والدین کو کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچائیں، ان کی نافرمانی کا ارتکاب کریں اور ان کی خدمت کرکے، ان سے حسنِ سلوک کرکے اپنی عاقبت نہ سنواریں اور اپنے لیے جنت یقینی نہ کرلیں۔

اس حدیثِ پاک میں حضور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدمت اور حُسنِ سلوک کا پہلا حق دار ماں کو فرمایا۔ احقاف میں ارشادِ خداوندی ہے وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۱۰ اور ہم نے آدمی کو حکم کیا کہ اپنے ماں باپ سے بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے اسے اپنے پیٹ میں رکھا تکلیف سے، اور جنا اس کو تکلیف سے اور اسے اٹھائے پھرنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینہ میں ہے۔

آیت کے شروع میں خالق و مالکِ حقیقی نے حسنِ سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لیے دیا مگر پھر بعد میں صرف ماں کی شفقت و محبت کا اور ان تکلیفوں کا ذکر کیا جو وہ اپنی اولاد کے لیے اٹھاتی ہے۔ اولاد کی پرورش میں باپ سے زیادہ ماں کو تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں، اس لیے خداتعالیٰ نے بھی والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم دے کر ماں کی تکلیفوں کو گنوایا اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بھلائی، خدمت اور حسنِ سلوک کے پہلے تین درجے ماں کو بخشے، پھر باپ کو اور پھر باقی رشتہ داروں کو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں والدین کی خدمت کرنے، ان کے ساتھ حُسنِ سلوک اور بھلائی کرنے کی توفیق بخشے ——

مومن کون

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَایُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَایُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَایُؤْمِنُ، قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِیْ لَایَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا: خدا کی قسم، وہ ایماندار نہیں ہے، خدا کی قسم وہ ایماندار نہیں ہے، خدا کی قسم وہ ایماندار نہیں ہے۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہ! کون مومن نہیں ہے؟ فرمایا وہ شخص جس کے ہمسائے اس کی برائیوں سے مامون و محفوظ نہ ہوں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی گزارنے کے طریقے سکھائے ہیں۔ زندگی کے تمام مراحل میں ہمیں جو مسائل پیش آ سکتے ہیں، ان کا حل آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء نے پہلے ہی فرما دیا۔ ہمیں کس موقع پر کس کس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، ہمیں کس مرحلے سے بطریقِ احسن گزرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا بہتر ہے، ہم زندگی میں پیش آمدہ مشکلات و مصائب سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور کون سی راہ پر چلنے سے ان مصائب و آلام سے محفوظ رہ سکتے ہیں ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح سے

ہماری رہنمائی فرما دی۔ آقا حضور کے کسی نام لیوا کو اس کی حاجت کبھی پیش نہیں آتی کہ وہ دین کی رہنمائی کو ناکافی پائے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے کسی اور طرف دیکھے۔

حضورِ پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے حُسنِ معاشرت پر بہت زور دیا ہے، معاشرے کو ہر قسم کی ابتری اور افراتفری سے بچانے کی راہیں سجھائی ہیں۔ وہ طریقے بتائے ہیں جن سے ماحول کو تکدر کے غبار سے محفوظ رکھا جا سکے، مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعور پروان چڑھے اور لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں، کوئی کسی دوسرے کو کسی حیثیت سے بھی تکلیف نہ پہنچائے۔

محولہ بالا حدیث پاک میں حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمسائے کے حقوق کی اہمیت جتائی ہے اور اس آدمی کے ایمان کی تغلیط فرمائی ہے جس کے شر سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہ ہو۔ یعنی جو شخص اپنے ہمسائے کو تکلیف پہنچائے، ہمسائے کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے، اس کی دل آزاری کرے، وہ جتنی چاہے عبادت کرتا رہے، نیکیوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہے ——— اس کی تمام نیکیاں رائیگاں جائیں گی، اس کی عبادت اس کے منہ پر دے ماری جائے گی، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایمان کو تسلیم نہیں فرمایا۔ تین مرتبہ یہ فرما کر کہ وہ ایمان دار نہیں ہے، حضور نے اس کے ایمان اور اس کے کردار کی دیگر تمام اچھائیوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے ——— اور جسے حضور کی بارگاہ سے دھتکار دیا جائے، جس کے متعلق حضور فرما دیں کہ وہ ایمان دار نہیں ہے، اس کی بدبختی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔

حضور فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی

بھائی قرار دیا ہے جس طرح ایک بھائی دُکھ سُکھ میں اپنے بھائی کا شریک ہوتا ہے
اس کی خوشی اسے مسرت و ابتہاج سے ہمکنار کرتی ہے اور ایک کی مصیبت
دوسرے کی راحت و سکون کو غارت کر دیتی ہے۔ ایسے میں اپنے قریب کے
بھائی دُکھ پہنچانے والا صاحبِ ایمان کیسے ہو سکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسائے کی عزت و تکریم کی ہدایت فرمائی۔
یہ تک فرمادیا کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کا ہمسایہ رات کو بھوکا سویا۔
سبحان اللہ! صرف اسی ایک فرمانِ نبوی پر اگر قانون سازی کر لی جائے تو معیشت
کے تمام بنیادی مسائل حل ہو سکتے ہیں اور ملک بھر میں کوئی شخص بھوکا نہیں
رہ سکتا ــــــ لیکن اس ارشادِ پاک کے اس پہلو کی اہمیت اپنی جگہ ہے کہ
ہمسائے کی تکلیف میں اس کا ساتھ نہ دینا بھی جرم قرار پاتا ہے چہ جائیکہ کوئی بدبخت
اپنی شرانگیزیوں کا ہدف اپنے ہمسائے کو بنائے۔

ہمارے نام مسلمانوں کے سے ہیں، ہم اسلام کے دعویدار بھی ہیں۔ حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے دعوے بھی ہماری زبانوں کا غازہ ہیں لیکن ہمارے
کردار (اِلّا ماشاء اللہ) ایسے ہیں کہ آقا ہمارے "بے ایمان" ہونے کا اعلان
فرمادیں۔

ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے قول یا عمل سے اپنے ہمسائے کو کوئی دُکھ
تو نہیں پہنچا رہے؟ ہم اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ اپنے پڑوسی کے گھر کے سامنے
کھڑا رہے ہے۔ ہم اونچی آواز سے ریڈیو یا ٹیلی ویژن تو نہیں سنتے کہ پڑوس میں رہنے
والوں کی پریشانی کا باعث بنتے ہوں۔ ہم اپنے گھر میں اتنا شور تو نہیں کرتے کہ
سامنے کے گھر والے تکلیف میں مبتلا ہو جائیں ــــــ بنیادی بات یہ ہے کہ مختلف
اعمال کے موقع پر کیا ہم اتنا سوچنے کا تردّد بھی گوارا کرتے ہیں کہ ان کا اثر ہمارے
ہمسایوں پر مثبت ہو گا یا منفی؟ ــــــ

آج کا دور نفسی نفسی کا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات میں گم نظر آتا ہے، کسی کو کسی
دوسرے کی بھلائی بُرائی کا احساس نہیں۔ شہروں میں خاص طور سے بے گانگی یہ
کیفیتیں بھرپور ہیں۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں۔ لوگوں کو یہ تک علم نہیں ہوتا کہ ان کے
ہمسائے میں رہنے والے کون ہیں، کیا ہیں، کتنے ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟ وہ کیا
کام کرتے ہیں، ان کی راحت و آرام کے پہلو کیا ہیں، ان کی تکالیف کے شعبے
کونسے ہیں؟۔ احسان دانش مرحوم نے شاید اسی کیفیت کو یوں ظاہر کیا تھا:

حشر سے ڈرتے ہو دانش، بزمِ دنیا سے ڈرو
نفسی نفسی ہے یہاں بھی کون کس کا آشنا

پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے تو اس بے گانگی بے توجہی اور کس مپرسی کی اجازت
نہیں دی تھی۔ اُنھوں نے تو ہمیں بھائی بھائی کہا تھا۔ اُنھوں نے تو فرمایا تھا کہ اگر میرا
پڑوسی بھوکا رہا تو گویا میرے لیے دوزخ کی خبر دے گیا۔ اُنھوں نے تو فرمایا کہ اگر
میرا پڑوسی میری شرانگیزی کا شکار ہو گیا تو گویا میرا ایمان غارت ہو گیا۔

ایسے میں بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم ہمسایوں کے احوال سے آگاہ
رہیں، ان کا دکھ درد ہماری تکلیف کا باعث ہو اور ان کی خوشیاں ہمارے ہونٹوں
اور آنکھوں میں گلاب کھلا دیں۔ ہم ہر کام کرتے وقت یہ ضرور سوچ لیا کریں کہ اس کا
اثر ہمارے پڑوسی بھائی پر کیا ہوگا۔ ہمارے کسی عمل سے اسے تکلیف تو نہیں ہوگی۔
شخصی آزادی کے نام پر کیے گئے کسی کام سے اگر ہم نے دانستگی یا نادانستگی میں اپنے
ہمسائے کے لیے تکلیف و رنج کا سامان کر دیا تو لازماً آقا حضور کی ناراضی مول لی، اپنے
ایمان کو ضائع کرنے کا سامان کیا اور یوں گویا اپنی دنیا و آخرت تباہ کر لی۔

اللہ کریم ہمارے ایمان کو سلامت رکھے، ہمارا ہر عمل ہمارے پڑوسیوں کے
لیے اچھا ہو یا کم از کم گوارا ہو اور ہمیں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو جائے!

مہمان نوازی اور میزبان آزاری

عَنْ اَبِیْ شُرَیْحٍ الْکَعْبِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ
ضَیْفَہٗ جَائِزَتُہٗ یَوْمٌ وَّلَیْلَۃٌ وَّالضِّیَافَۃُ ثَلَاثَۃُ اَیَّامٍ
فَمَا بَعْدَ ذٰلِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ وَّلَا یَحِلُّ لَہٗ اَنْ یَّثْوِیَ
عِنْدَہٗ حَتّٰی یُحْرِجَہٗ (صحیح بخاری، کتاب الادب)

ابو شریح کعبی سے روایت ہے، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ
مہمان کی خاطر کرے۔ ایک دن رات کی مہمانی لازمی ہے اور تین دن کی ضیافت افضل
ہے۔ اس کے بعد صدقے میں شمار ہوتی ہے۔ اور مہمان کے لیے مناسب نہیں کہ
میزبان کے پاس پڑا رہے اور اُسے تنگ کر ڈالے۔

حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مہمان نوازی اور میزبان آزاری
کے حوالے سے اُمت کی رہنمائی فرمائی ہے اور جہاں اپنے نام لیواؤں کو مہمان کی
خاطر تواضع کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، وہاں مہمان کے لیے بھی اُصول متعین کر دیا
ہے کہ وہ میزبان کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔

حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُسنِ معاشرت کے تمام پہلوؤں
پر توجہ فرمائی ہے اور ہر مرحلے میں اپنے اُمتیوں کی رہنمائی کی ہے۔ حضورؐ نے جہاں
ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا ہے کہ ایک کی تکلیف دوسرے کی
تکلیف کا باعث بنے اور دوسرے کی راحت پہلے کے آرام کا موجب ہو۔
جہاں سرکارؐ نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کام آئیں۔ کسی کی جان و
مال و آبرو پر حملہ کرنا ہمارے لیے حرام کر دیا گیا ہے۔ غریب کی مدد امیر کے لیے
لازمی کر دی گئی ہے۔ جس کا ہمسایہ اس کی شرانگیزیوں سے محفوظ نہ ہو، آقا حضورؐ
نے اُس کے صاحبِ ایمان ہونے کی تغلیط تین دفعہ خدا کی قسم کھا کر کی۔ غرض زندگی
کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جس کے لیے پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے رہنما اصول نہ بنا دیے ہوں۔

اگر کسی قوم کے معاشرتی رویّوں کی اصلاح کی ذمہ داری محسنِ انسانیت
قبول فرما لیں تو اس کی سرفرازی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم
اُن کی محبت کے دعویدار بنتے ہیں، اُن سے عقیدت کے ہمارے مظاہر بھی لوگوں کو
نظر آتے ہیں لیکن (الا ماشاء اللہ) ہم حضورؐ کے ارشادات و احکام سے صرفِ نظر
کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی لیے مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر ابھی ایک خواب
ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ سے جس اخوتِ اسلامی کا اجرا کیا تھا،
ہمیں جس بھائی چارے کی تعلیم دی تھی، ــــ اس کے پیشِ نظر اسلامی معاشرے
کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مفادات تج کر اور قربانیاں دے کر
اپنے مسلمان بھائی کی بہبود و فلاح کا باعث بنے۔ اگر کسی قوم کا ہر فرد دوسرے کی
بہتری چاہنے لگے، اس سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرے، اس کے ساتھ
تعلقات قائم کرتے ہوئے بے غرضی اور اخلاص کو پیشِ نظر رکھے تو پورا معاشرہ

"بنیانٌ مرصوص" کی کیفیت کا حامل بن جائے، قوم کے سارے فرد خوشحال ہو جائیں اور ملت سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی —— ہر لحاظ سے مضبوط و مستحکم ہو جائے۔

رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مسلمانوں کو صرف بھائی بھائی قرار دینے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ مختلف مواقع پر اخوتِ اسلامی کی تفصیلات و جزئیات میں بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ اسلامی معاشرے میں میل جول اور باہمی تعلقات کی بہت اہمیت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، جس شخص کا پڑوسی رات کو بھوکا سویا، جنت اُس کے نصیب میں نہیں۔ کسی مسلمان کا قتلِ عمد قاتل کے ایمان کی تغلیط کا نشان ہے۔ حضور نے فرمایا، جو حسد کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ دوسروں کی غیبت، عیب جوئی، ان کے معاملات کی کھوج لگانا بہت بُرا قرار پایا۔ غرضیکہ تمام ایسے کام ممنوع کیے گئے جن کی وجہ سے افتراق و انتشار کو ہوا ملتی ہو اور وہ سب کلم مستحب ٹھہرے جن سے آپس میں میل جول اور محبت کو فروغ ہو۔

اسی لیے فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی رزاقیت و ربوبیت پر ایمان رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ قیامت کے دن اس کے اعمال کی پُرسش ہو گی، اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مہمان کی تواضع کرے۔ دین یا خاندان کے رشتے سے کوئی بھائی اگر کسی بھائی کے پاس آجائے تو اس کے لیے لازمی ٹھہرایا گیا کہ ایک دن اور رات مہمان کی خدمت کرے۔ تین دن کی ضیافت کو افضل قرار دیا گیا۔ اور اس کے بعد کی مہمانداری کو صدقہ فرمایا گیا —— اس سارے عمل میں میزبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ماتھے پر بل نہ پڑے، اس کے دل میں تنغّض کے آثار نہ اُبھریں اور وہ مہمان کو بوجھ نہ سمجھے —— لیکن دوسری طرف آقا حضورؐ

نے مہمان کی حدود بھی متعین فرما دیں کہ اس کے لیے یہ درست نہیں کہ میزبان کے ہاں پڑا رہے اور اسے تنگ کر ڈالے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میزبان کے لیے ضروری فرمایا کہ وہ ایک دن رات مہمان کی خدمت کرے۔ پھر آقا نے تین دن کی ضیافت کو افضل فرمایا۔ اس کے بعد کی مہمانداری کو صدقہ قرار دیا۔ اس ارشاد میں جہاں یہ حکمت ہے کہ مہمان کو کسی طرح اور کبھی بوجھ نہ سمجھا جائے، وہاں بین السطور یہ ہدایت بھی ہے کہ مہمان کے لیے اتنا تکلف بھی نہ کیا جائے کہ اگر اس کے ایک دن رات مہمان رہنے یا تین دن ضیافت کھانے سے بات بڑھ جائے تو آپ گوشت کے بجائے دال اور تکلفات کے بجائے بیزاری تک آجائیں اور اس کے نتیجے میں اس سے تنگ آکر ارشادِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے مرتکب ہو جائیں۔ اگر شروع ہی سے آپ تکلفات سے نفور رہیں گے، اپنی اوقات اور اپنے وسائل سے بڑھ کر مہمان داری کی کوشش نہ کریں گے تو مہمان بعد میں آپ کے لیے بوجھ نہیں بنے گا اور یہی ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان کے لیے یہ شرط بھی نہیں رکھی کہ وہ مسلمان ہو۔ جو بھی شخص آپ کے پاس مہمان کے طور پر آجائے، اس کی خاطر مدارات آپ کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اگر کسی غیر مسلم کو آپ کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہو اور آپ اس سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں، جس کا حکم آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء نے دیا ہے تو وہ اسلام اور اہلِ اسلام سے متاثر ہو گا اور عین ممکن ہے کہ اس طرح راہِ راست پر آجائے اور آپ کسی کو کفر کی ضلالتوں سے بچا کر دینِ اسلام کے انوار سے مستفید کرنے کا باعث بن جائیں۔

سرکارِ والا تبارؐ نے میزبان کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مہمان کو بھی ہدایت فرما دی کہ وہ میزبان کے پاس اتنی دیر ہی رہے، جس سے محبت بڑھے، تعلقات میں

اضافہ ہو ——— نہ یہ کہ طبیعتوں پہ یہ عرصہ بوجھ بن جائے، تعلقات سرد مہری کا شکار ہو جائیں اور دلوں میں دوری پہ منتج ہوں۔

اس طرح مہمان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ میزبان کے وسائل کو پیشِ نظر رکھے۔ اگر کسی شخص کے پاس مہمان کو رکھنے کی جگہ ہی نہیں ہے، تو اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اس پہ بوجھ بننا درست نہیں۔ اسی طرح اگر میزبان غریب اور مفلوک الحال ہے تو مہمان اس پہ کم سے کم بوجھ ڈالے اور جتنا بوجھ ڈالے، اس کو بھی کسی نہ کسی طرح کم کرے یا ختم کر سکے تو بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میزبان کو تنگ نہ کرنے کی ہدایت فرما کر مہمان کی ان تمام اُمور میں رہنمائی فرما دی ہے۔

جو لوگ دوسروں کے ہاں بطور مہمان نہیں جاتے یا اُن کے ہاں بوجوہ دوسرے لوگ نہیں آتے، وہ معاشرے سے کٹ جاتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں تو اس طرح جو خرابیاں اور خامیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ تو ہوتی ہی ہیں' ——— ذاتی طور پر معاشرے سے اس طرح کٹے ہوئے لوگ محبتوں سے عاری زندگیاں گزارتے ہیں اور اپنی زندگی کو موت کے مماثل بنا لیتے ہیں۔

طاقتور کون

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقت ور وہ نہیں جو کُشتی میں اپنی طاقت کا لوہا منوالے۔ طاقتور وہ ہے جو حالتِ غضب میں اپنے نفس پر قابو پا لے۔ (صحیح بخاری)

غصہ عقل کا دشمن ہے اور دینِ متین کی تبلیغ کی بنیاد عقل ہے۔ سرورِ کائنات علیہ السلام و الصلوٰۃ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو خرقِ عادات کے بل بوتے پر نہیں۔ آپ نے محیر العقول واقعات اور معجزات کے حوالے سے لوگوں کو اپنی طرف نہیں بلایا۔ بلکہ اپنی چالیس سالہ حیاتِ مطہرہ کو لوگوں کے سامنے رکھ کر گویا ان کی عقلوں کو امتحان میں ڈالا کہ وہ اگر کر سکتے ہوں تو اس پاک زندگی کے کسی پہلو پر انگشت نمائی کریں۔ اہلِ مکہ نے سوچ سمجھ کر جواب دیا کہ ابنِ عبداللہ سچے ہیں، امین ہیں، ان کی حیاتِ طیبہ ہر لوث سے پاک ہے، کہیں انگشت نمائی اور حرف زنی کی گنجائش نہیں۔ یہ ہوا تو آقا حضورؐ نے حق کی دعوت دی، اپنی نبوت کا اعلان فرمایا، خدا کی اُلوہیت و وحدانیت کی تبلیغ کی۔

تبلیغ کا پہلا درس بھی عقلوں کو سلب کر کے نہیں دیا، دعوتِ تفکر کے ساتھ یہ پہلا سبق سکھایا گیا کہ اپنے مخالفین کی عقلوں میں یہ حقیقت راسخ کر دی کہ اگر حضورؐ یہ اطلاع

دیں کہ پہاڑ کی دوسری طرف دشمن کی فوج ہے اور حملہ آور ہوا ہی چاہتی ہے ــــ تو یہ خبر اس لیے غلط نہیں ہو سکتی کہ کہنے والے کی زندگی کے چالیس سال شب و روز انہی لوگوں میں گزرے ہیں، تو وہ آج بھی سچ ہی بولیں گے، ان کا کہا ہوا جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو عقل کے کانوں سے سنا، اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا، وہ توحید خداوندی اور رسالتِ محمدی پر ایمان لے آئے۔ اور غصّے اور غضب نے جن کی عقل سلب کر لی، جو حالتِ غضب میں اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے، آقا حضورؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ کمزور مسلمانوں کے مقابلے میں انہوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہا، مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ آخر کار کتنے بودے ثابت ہوئے اور میرے آقا و مولا کا یہ ارشادِ گرامی کتنا سچا نکلا کہ طاقتور وہ ہے جو غصّے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو پالے اور جسمانی اور مادی طاقت پر گھمنڈ غلط ہے۔

خداوند قدوس و کریم نے اپنا آپ منوانا چاہا ہے تو دلیل اور بُرہان کے طور پر اپنے مظہرِ اتم کو دنیا میں بھیجا ہے، اپنے شعائر اور آیات کے ذریعے اپنی پہچان کرائی ہے۔ انسان کو تدبّر و تفکّر کی دعوت دی ہے، اونٹ کی خلقت، آسمانوں کی رفعت، پہاڑوں کی نصیب اور زمین کے مسطوح ہونے کی خاصیتوں کا ذکر کر کے انہیں سوچنے سمجھنے پر اکسایا ہے اور بتایا ہے کہ ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان میں غور کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علوم و فنون کو سیکھنے کی طرف لوگوں کو راغب کرنے والا ہی سچا خالق ہے۔ خالقِ کائنات نے ہمیں کائنات کی تمام اشیا میں غور و فکر کی اہمیت بتائی ہے، ہمارے لیے شمس و قمر کو مسخر کر دینے کی بشارت دی ہے، ہمیں اپنی نشانیوں پر غور کرنے اور اس کے نتیجے میں ان نشانیوں کے خالق کو تسلیم کرنے کو کہا ہے۔ ایسا سچا خالق و مالک اور اس کا پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) جنہوں نے ہمیں ہر بات عقل کے ذریعے سکھانی چاہی ہے یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے بندے عقل کو سلب کر دینے والی "صفت" کے عادی بن

جائیں یا کبھی اس کا شکار ہو جائیں۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے بھی فرمایا۔ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔
غصّہ پینے اور لوگوں کو معاف کرنے والوں کو اللہ کریم نے "محسن" فرمایا ہے اور ان سے اپنی محبت کا اعلان کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ان رجلا قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اوصنی قال لا تغضب فردد مرارا قال لا تغضب ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آقا! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا، غصہ مت کیا کرو۔ بار بار آپ یہی فرماتے رہے (بخاری)

ملاحظہ فرمائیے۔ سرکار کی یہی نصیحت تھی۔ بار بار فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو غصہ نہیں ہو گا تو عقل کام کرے گی۔ عقل کام کرے گی تو معلوم ہو گا کہ اس کائنات کے ایک ایک ذرّے سے ہم شبانہ روز استفادہ کرتے ہیں جسے خدا تعالیٰ نے بنایا ہے۔ ہمارے جسم کے تمام اعضا ہمارے لیے خدا کی ایک عظیم نعمت ہیں۔ ہمیں کائنات کی تمام چیزوں میں تفکر و تعمق سے کام لے کر علوم سیکھنے ہیں۔ سائنس میں نام پیدا کرنا چاہیے، تسخیرِ کائنات کی راہ پر چلنا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء کو بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن ــــ اگر غصے نے ہماری عقل پر قابو پا لیا تو نہ ہم خدا کو جان لینے کی کوشش کریں گے، نہ اس کے محبوب پاک صاحب لولاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علومِ تربیت کا احساس کریں گے، نہ خدا اور رسولؐ کے احکام و فرامین کی غایتوں کو سمجھنے کی سعی کریں گے ــــ اور اس طرح دنیا و آخرت میں گھاٹے کا سودا کریں گے۔

جب کوئی شخص حالتِ غضب میں ہو، غصّے کی کیفیت اس پر غلبہ حاصل کر لے تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور معاشرتی زندگی، ازدواجی تعلقات

گھریلو اور خاندانی معاملات اور ملکی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں رہتا۔
ہم نے غصے کی حالت میں لوگوں کو ایسے فیصلے کرتے ہوئے دیکھا ہے جن پر انہیں زندگی بھر افسوس رہتا ہے اور ان کا ازالہ کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اتنے طاقتور ہیں کہ غصے پر قابو پا لیتے ہیں تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتے ہیں۔ یہ جو اخبارات میں ہر روز قتل کی وارداتوں کی باتصویر رپورٹنگ ہوتی ہے، ان کے پس پشت غصے کی تلوار کام کر رہی ہوتی ہے۔ غصے پر قابو نہ پانے سے گھر اجڑ جاتے ہیں، خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے اور ماحول نفرت کے اندھیاروں کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔
اسلام دنیا میں ایک صالح معاشرے کی تشکیل کا داعی ہے، کہ نفرتوں سے پاک اور محبتوں کا نام لیوا معاشرہ۔ اور اگر غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو پانے والے افراد عام نہ ہوں تو ایسا معاشرہ قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض رہنا روا نہیں۔ اور صلح میں پہل کرنے والا اللہ و رسولؐ کے نزدیک زیادہ اچھا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ غصہ تھوک دیجیے۔ اس طرح آپ دشمنوں سے زیادہ دوست پیدا کریں گے جو دکھ درد اور مسرت و انبساط کی حالتوں میں آپ کے ساتھی ہوں گے۔ آپ سب مل کر ایک بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔ آپ کی صلاحیتیں دوسروں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں یا غیظ و غضب کی حالت میں سوچتے کڑھتے رہنے میں ضائع نہیں ہوں گی۔ بلکہ ملک و قوم کی بہتری، اجتماعی ترقی اور معاشرے کی بہبود میں صرف ہوں گی۔
آقا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اور خالقِ کائنات جل و علا نے غصے کو پی جانے کی اہمیت بھی بتائی ہے اور اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ یہ کام ہے بہت مشکل۔ اسی لیے سرکار نے فرمایا کہ طاقت کا سب سے بڑا مظاہرہ یہی ہے کہ آدمی غصے کی حالت میں نفس پر حاوی ہو جائے اس پر قابو پا لے۔ پھر —— خدا اور رسولؐ سے محبت

کے ہم دعویٰ کو یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ہم کیا ہیں؟ کیا ہم اپنی طاقت کا مظاہرہ مختلف "اکھاڑوں" ہی میں کرنا پسند کرتے ہیں یا آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بھی اپنی صلاحیتوں کے استعمال کرنے کی اہمیت سے بہرہ ور ہیں۔ جب کوئی ایسا موقع آتا ہے جب غصہ ہم پر غالب آنا چاہتا ہے تو ہمارا رویّہ کیا ہوتا ہے۔ کیا ہم غصے سے مغلوب ہو جاتے ہیں، اسے اپنے قویٰ پر نافذ کر لیتے ہیں یا اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ اگر ہم غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہیں تو سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہم طاقتور ہیں۔ خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہم محسنین کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم غصہ پی جائیں تو خدا ہم سے محبت کرنے لگتا ہے، سرکارؐ ہمیں سب سے زیادہ طاقتور ہونے کی سند عطا فرما دیتے ہیں —— اور اگر ایسا نہیں تو ہماری حیثیت کیا ٹھہرتی ہے؟؟؟

مرضِ غضب اور اس کا علاج

عَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عُرْوَةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطٰنِ وَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا تُطْفَئُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ

عطیہ بن عروہ سعدی سے روایت ہے، رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا، غصہ کرنا شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ جس وقت تم میں سے کسی کو غصہ آئے، اُسے چاہیے کہ وضو کرے۔ (سنن ابو داؤد)

اسلام نے ہمیں حسنِ معاشرت کے ابدی اصول سکھائے ہیں۔ ایک متوازن معاشرے میں ایک فرد دوسرے سے محبت کی نسبت رکھتا ہے اور اس کے دکھ درد میں اس کا ساتھی اور ساجھی ہوتا ہے، مسرتوں میں شراکت اور غم و آلام کے زخموں پر پھاہے رکھنا ماحول کو خوشگوار بناتا ہے۔ جس معاشرے کی بنیاد محبت پر نہ ہو، وہ کبھی مضبوط نہیں ہوتا اور بالآخر اس کی عمارت ڈھے کے رہتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے مسلمانوں کو محبت، مروّت اور اخوت کا درس

دیا ہے، انہیں آپس میں مل جل کر رہنے کی تلقین کی ہے اور ہر اس کام سے اجتناب کی ترغیب دی ہے جس سے گروہوں یا افراد کے درمیان دوریاں جنم لیں، دشمنیاں پیدا ہوں اور شکر رنجیاں دلوں کو زخمی کرنے کا موجب بنیں۔

خدا اور رسولِ خدا نے ہمیں آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے، ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رہنمائی میں صحابہ کرام نے اخوت کا مثالی نمونہ ہمارے پاس پیش کیا اور بتایا کہ جب ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے تو کس طرح دوسرے کی تکلیف پر پریشان ہوتا ہے اور کس طرح اسے اپنے سکھوں میں شامل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل و علی نے ہمیں ایک دوسرے سے محبت کا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، کوئی ایسی بات بھی کسی دوسرے مسلمان کی غیر حاضری میں کرنے سے روکا ہے جو اگر سچی ہے مگر اس مسلمان کے خلاف ہے۔ ایسا کرنے کو "غیبت" قرار دیا گیا ہے اور اُسے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا۔ ایک دوسرے سے حسد کرنے والوں کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ماننے سے انکار فرما دیا۔ قتلِ مسلم پر سخت وعیدیں دی گئیں، غرضیکہ ہر طرح سے مسلمانوں پر مشتمل ایک پاک صاف معاشرہ تشکیل دینے کی راہ سُجھا دی گئی۔

ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کی راہ میں جو جو کام رکاوٹ ڈال سکتے ہیں یا جن حرکات سے معاشرے کے باسیوں کے سکون میں خلل پڑ سکتا ہے، ہر ایسے کام اور ہر ایسی حرکت سے اسلام نے ہمیں منع کر دیا ہے۔ ان کاموں میں ایک کام غصہ بھی ہے۔ غصہ عقل کا دشمن ہے اور جب کوئی شخص اس جذبے کے زیرِ اثر ہو، تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو جاتا ہے۔ اور عقل کی حیثیت اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ حضور سرورِ انبیاء صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے اعلان کے موقع پر بھی لوگوں کی عقلوں کو سلب کرکے بات نہیں کی۔ کسی معجزے کے ظہور کے ساتھ اپنی نبوت کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ لوگوں کو سوچنے کا موقع دیا، انہیں غور و فکر کی دعوت دی۔ انہیں اپنی چالیس سالہ زندگی کا حوالہ دے کر پوچھا کہ آیا ان کی حیاتِ طیبہ کے کسی گوشے پر اعتراض کی کوئی گنجائش ہے؟ جب سب نے اعلان کیا کہ ان کی سابقہ زندگی پر کسی قسم کا داغ نہیں ہے، وہ صادق ہیں، امین ہیں —— تو سرکار نے انہیں خدا کی عبادت کی راہ دکھائی، اس کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا اعلان فرمایا۔ حضور کسی معجزے کے ساتھ یہ اعلان فرماتے تو لوگ اس کو اپنی عقل سے ماورا سمجھ کر اسے قبول کرتے۔ لیکن آقا نے ایک روشن دلیل کے ذریعے حق کی تبلیغ کا آغاز فرمایا۔

ایسے میں وہ جذبہ جو عقل کو سلب کرلے، جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لے، اسلام میں کسی طرح پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کو کارِ شیطان قرار دیا —— کہ جب شیطان کسی کو راہ راست سے بھٹکانا چاہتا ہے تو اسے غصے کے زیر اثر لے آتا ہے۔ اس سے نہ صرف خود اس فرد کا نقصان ہوتا ہے بلکہ آس پاس پر تکدر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔ خود خالق و مالکِ حقیقی جلّ شانہٗ نے فرمایا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی غصے کو پی جانے والوں اور لوگوں کو معاف کردینے والوں کو اللہ کریم نے "محسنین" فرمایا اور کہا کہ خود اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ یعنی غصہ شیطان سے ہے اور غصے کو پی جانے والے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔

جو شخص شیطان کے زیر اثر آجائے، وہ آتشِ غضب سے بھڑک اٹھتا

ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو کھو کر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے، غصے سے مغلوب ہو کر لوگ اپنے قریبی ساتھیوں اور عزیزوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر بیٹھتے ہیں جو اسلام کے نزدیک غلط ہے۔ یہ جو آئے دن اخبارات میں قتل و غارت کی خبریں نظر آتی ہیں، ان میں سے بیشتر کا محرک غصہ ہی ہوتا ہے۔ غصہ معاشرے کے سکون کو غارت کردیتا ہے اور محبت و اخوت کی فضا خواب و خیال ہو کر رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں غصے کو ضبط کرلینے والوں کے علوِ مرتبت کا ذکر فرمایا ہے، انہیں اپنا محبوب قرار دیا ہے اور اس پر قابو پانے کے لیے ایک نسخہ بھی بیان فرما دیا ہے —— کہ لوگوں کو معاف کردو۔ ظاہر ہے جس کو غصہ آئے، اگر آپ خدا کے حکم کے پیشِ نظر اسے معاف کردیتے ہیں تو غصے پر کنٹرول کرلیتے ہیں اور محبوبیتِ خداوندی کا مقام ارفع حاصل کرلیتے ہیں۔

حضور سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوداؤد کی محولہ بالا حدیث میں غصے پر قابو پانے کا ایک خارجی طریقہ بھی بیان فرما دیا ہے۔ فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ کا توڑ پانی ہے اس لیے جب تمہیں غصہ آئے تو وضو کرو۔

ایک مسلمان عبادت کی خاطر وضو کرتا ہے تو اپنے آپ کو صاف بھی رکھتا ہے اسی لیے صفائی کو نصف ایمان بھی کہا گیا ہے، اطبا سے پوچھیے تو انسان کی صحت کو برقرار رکھنے میں وضو بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پاک سے وضو کا ایک اور فائدہ یہ معلوم ہوا کہ یہ دافعِ غضب بھی ہے۔

وضو کے ذریعے ایک تو آپ کو اعصاب کے نہایت پہلوؤں کو پانی سے

تر کرنا پڑتا ہے، اس طرح بھی غصّے کے ذریعے پیدا ہونے والی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے۔ دوسرے، وضو کے فرائض، سنن اور مستحبات کا اہتمام کرتے ہوئے اور ضروری اوراد کے ذریعے عقل کو ایک اور مصروفیت آپڑتی ہے تیسرے خدا تعالیٰ کی خشیت کا سیلاب غصّے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اسی لیے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان کی اس حرکت کو زائل کرنے اور اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ انسان وضو کا اہتمام کرے۔

مسلمانوں کی جان و مال و آبرو کا احترام

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ وَلَا یَحْقِرُہٗ اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَیُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِہٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِیٍٔ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ یَّحْقِرَ اَخَاہُ الْمُسْلِمَ کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَ مَالُہٗ وَعِرْضُہٗ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر نہ ظلم کرے، نہ اُسے رسوا ہونے دے اور نہ اسے ذلیل و حقیر سمجھے۔ تقویٰ اس جگہ ہے۔ یہ فرما کر آپ نے تین مرتبہ سینے کی طرف اشارہ کیا اور پھر فرمایا، انسان کے لیے اتنی بُرائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر اور ذلیل سمجھے۔ مسلمان کی ساری چیزیں، اس کا خون، اس کا مال اور آبرو، دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح)

سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے اس ارشادِ مبارک کے ذریعے اخوتِ اسلامی کی تشریح فرمادی ہے، اس سلسلے میں مسلمان کے حقوق و فرائض کی نشاندہی فرما کر اس کے لیے راہِ عمل متعین کر دی ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ بھائی ہونے کی حیثیت سے دونوں کے حقوق اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ سرکار

والاتبار نے ان کی طرف واضح اشارات فرما دیے ہیں۔ دنیا اس اسلامی اخوت کے برگ و بار کو دیکھ چکی ہے، کائناتِ عالم اسلام کے مضبوط رشتے میں منسلک لوگوں کے اشتراکِ عمل سے انجام دیے جانے والے کارناموں سے واقف ہیں۔ مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ جب آپس میں بھائی بھائی بن گئے تو چشمِ عالم نے دیکھا کہ مشرکین و کفار کو شکستِ فاش ہوئی، اُن کے عزائم مذموم شکست و ریخت کی نذر ہو گئے، تکبر اور غرور سے اکڑی ہوئی گردنیں جھکنے پر مجبور ہو گئیں —— اور صرف مکہ ہی کے کفار و مشرکین نہیں، دنیا بھر کے جابر و ظالم ہیبتِ اسلام و مسلمین سے کانپنے تھرتھرانے لگے۔ اور اہلِ اسلام نے جس طرف رُخ کیا، کامرانیوں نے اُن کا استقبال کیا، سیلاب کا یہ دھارا کفر و ضلالت کے خس و خاشاک کو بہا لے گیا اور دنیا بھر میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

اسلام انسانی زندگی کے لیے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اس امر کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کا ایک حصہ ہم اپنا لیں اور کچھ حصوں پر عمل درآمد کو ترک کر دیں یا مؤخر کر سکیں۔ اس کی برکات سے متمتع ہونے کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے تمام و کمال اپنایا جائے۔ گفتار کے چہرے پر بھی اسی کا غازہ ہو اور کردار کے جسم بھی اسی سے غسل کریں۔ اس صورت میں یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ہم معاشرے کی غلاظتوں کے حوالے سے اپنے بھائی کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں حقیقتاً حقیقی بھائی یا دینی بھائی اُسی سلوک اور رویّے کا مستحق بھی ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ قعرِ مذلت کی ان گہرائیوں میں جا پڑا ہے کہ ہمیں اپنے بھائی سے محبت نہیں رہی، خون سفید ہو گئے ہیں، ہم بھائیوں کے حقوق غصب کرنے میں دیدہ دلیر ہو گئے ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے۔ اس سے یہ استنباط غلط ہو گا کہ دینی بھائی سے حقیقی بھائی کی بہ نسبت اچھا سلوک تو نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سگا بھائی بدرجۂ اولیٰ ہمارا دینی بھائی ہے۔ ہمیں اپنی زندگیاں

خدا اور رسولِ خدا (جل شانہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام و ارشادات کی روشنی میں گزارنا چاہئیں۔ رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے خداوندِ کریم نے اس اخوت کی اہمیت محکم کے ذریعے ہم پر واضح کر دی ہے —— تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشتے کی تشریح و توضیح بھی فرما دی ہے، اس کی جزئیات کی طرف بھی ہمیں متوجہ کیا ہے، ہمیں اس رشتے کے معنی بھی سمجھائے ہیں۔

آقا حضور نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اسلامی اخوت کے اس رشتے کی عمارت کس بنیاد پر کھڑی ہو گی۔ اس میں ہمارے حقوق کیا ہوں گے، ہمیں کن اوامر و نواہی کا خیال رکھنا ہو گا اور ہماری ذمہ داریاں کیا ہوں گی۔ ہمیں کن امور کی طرف توجہ دینی ہو گی۔ میں اور آپ مسلمان ہیں تو آپ مجھ پر اور میں آپ پر ظلم نہیں کریں گے۔ ہم بھائی اسی صورت میں ہیں کہ سرکار کے اس ارشاد کو پیشِ نظر رکھیں۔

اگر میں نے آپ پر کسی طرح کا کوئی ظلم روا رکھا تو میرا اسلام خطرے میں ہے۔ میں مسلمان اسی صورت میں ہوں کہ آپ کو بھائی سمجھوں اور آپ کا بھائی اسی صورت میں ہوں کہ محبوبِ خدا علیہ التحیۃ والثنا کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر آپ پر ظلم نہ کروں۔

ہم اسلام کے نام لیوا معاشرے کے فرد ہیں۔ ہم نے اسلام کے نام پر ایک ملک حاصل کیا تھا۔ اور اب اس کے باسی ہیں۔ میں اور آپ دونوں مسلمان کہلاتے ہیں تو ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنا ہو گا کہ کیا ہم کسی مسلمان بھائی پر ظلم کے مرتکب تو نہیں ہوتے۔ یہ بات تو بہت آسان ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو وعظ کرے، نصیحت پلائے اور اچھی باتیں بتائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ایسی خالی خولی تبلیغ ہمارے کسی کام کی نہیں۔ ہمیں تو احتسابِ نفس درکار ہے، خود احتسابی کی ضرورت ہے، اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنا پڑے گا۔ میں نے جو کچھ قرآن و حدیث میں پڑھا ہے یا جو کچھ دوسروں کو بتاتا ہوں، خود اس پر عمل کرتا ہوں یا نہیں۔ جو بات میرے علم میں ہے،

وہ عمل میں بھی ہے یا نہیں، اگر ہم افکار و افعال اور گفتار و کردار میں یکسانیت کا اہتمام نہ کر سکے تو یہ انفرادی حیثیت میں باوقار ہوں گے، نہ اجتماعی حیثیت سے کوئی حیثیت حاصل کر سکیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر مسلمان کو بھائی سمجھیں ——— صرف کہنے پر اکتفا نہ کریں۔ ہم نے دل سے ایسا کیا تو ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر ظلم روا نہ رکھے گا اور محبت و اخلاص کی بنیاد پر ایک صالح معاشرہ اور مضبوط و منظم قوم تعمیر ہو گی۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک میں مسلمان کی مسلمان پر ظلم کی منابی کے ساتھ تلقین کی گئی ہے کہ کسی مسلمان کو رسوا نہیں کرتا ہے، نہ اُسے رسوا ہونے دیتا ہے۔ اس ارشاد کی معنویت پر غور کیجیے اور پھر اپنے اعمال و کردار پر، ہم کس کس مسلمان بھائی کو رسوائی کی سان پر نہیں چڑھاتے، کون کس بھائی کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

کیا ہم دن بھر کسی نہ کسی بھائی کی رسوائی کا سامان نہیں کرتے رہتے۔ اگر یہ ہے تو ہمارا دعویٰ اسلام کیسا ہے، ہم کس اخوت کے دعوے دار ہیں، ہم کیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے داعی ٹھہرے کہ ان کے حکم پر عمل پیرا ہی نہیں ہوسکتے۔ سرکار نے تو ہمیں فرمایا ہے کہ اپنے دینی بھائی کو رسوا کرتا ہے، نہ اسے رسوا ہونے دیتا ہے۔ پھر کیا ہم سرکار کے ان الفاظ کو اپنی پوری معنویت کے ساتھ اپنے دل و دماغ میں جاگزیں ہونے دیتے ہیں۔ نہیں، تو پھر ہمارا کردار کیا ٹھہرا ——— ؟

آقا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اخوتِ اسلامی کا تیسرا ستون اس احساس کو قرار دیا ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو حقیر و ذلیل نہ سمجھے۔ ہم اخوتِ اسلامی کو ایک انقلابی قدم قرار دیتے ہیں۔ اس کے حسنات گنواتے ہیں لیکن اس کے لازمی اجزا کو اپنی زندگیوں پر کس حد تک نافذ کرتے ہیں ——— اصل مسئلہ یہ ہے۔ کیا ہم میں سے ہر شخص دوسرے کو کسی نہ کسی حیثیت سے ذلیل کرنے پر تُلا ہوا نظر نہیں آتا۔ کیا

معاشرے میں وہ شخص حقیر نہیں سمجھا جاتا جو حسرت زدہ ہو، مفلس ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے کہ میلے کچیلے لباس میں ملبوس میں کوئی شخص دیکھ کر آپ کے ذہن و احساس پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ کیا مالک ملازم کو، افسر ماتحت کو، کسی ایک لحاظ سے "بڑا" شخص اپنے سے "چھوٹے" کو ذلیل و حقیر سمجھنے کا گناہ نہیں کرتا۔ اگر میری بدگمانی درست نہیں تو واقعی ہمارا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہے، ہم واقعی مسلمان ہیں، ہم حقیقتاً آپس میں بھائی بھائی ہیں، لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر بات کیا ہی ؟

حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کے، دوسرے مسلمان بھائی کو ذلیل و حقیر سمجھنے کو تقویٰ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ آپ نے تین مرتبہ سینے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تقویٰ اس جگہ ہے اور فرمایا کہ انسان کے لیے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے۔ اندازہ فرمایئے، سرکار نے اس بات کو سب سے بڑی برائی قرار دیا ہے کہ اس سے زیادہ برائی انسان میں کیا ہو گی۔ اب اگر حضور کی نظر میں ہم سب سے زیادہ برا نہیں بننا چاہتے تو ہمیں اس عادت کو ترک کرنا ہو گا۔

حدیث پاک کے آخر میں حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء نے مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو کو دوسرے مسلمان پر حرام فرما دیا۔ مسلمان کا خون اس کے مسلمان بھائی پر حرام ہے تو ہمارے اخبارات بیسیوں قتلوں کی خبریں لے کر کیوں طلوع ہوتے ہیں۔ مرنے والے مسلمان نہیں ہوتے یا مارنے والے اس صفت سے عاری ہو چکے ہوتے ہیں ؟ پھر اس معاشرے کو کیا ہو گیا ہے ؟ کیا ہمارے ماحول میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ——— اور اس کے باوجود ہم سب مسلمان ہیں ؟

خون کی طرح مسلمان کا مال اور اس کی آبرو بھی مسلمان پر حرام ہے۔ لیکن اس

حیثیت سے بھی ہم "تسلیم و رضا" کی کس منزل پر ہیں، ہم میں سے ہر شخص اپنا آئینہ خود دیکھ سکتا ہے۔ دن بھر میں کتنے مسلمان بھائیوں کا مال ہم کس کس طریقے سے کھا جاتے ہیں، کس کس مسلمان بھائی کی آبرو کس کس مسلمان بھائی کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بنتی۔ لین دین کی بنیاد پر کتنے جھگڑے، کس قدر مقدمے ہر روز قائم ہوتے ہیں، کون سوچتا ہے کہ وہ جس "آبرو" کو میلی نظر سے دیکھ رہا ہے، وہ اس کے ایک مسلمان بھائی کی آبرو ہے اور یہ اس پر حرام ہے۔ اور اگر وہ مسلمان ہونے کا ادعا رکھتا ہے تو اتنا بڑا جرم کر رہا ہے جس کا کوئی اور چھور نہیں، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ آقا حضور اس کی حرکت کا نوٹس لے رہے ہیں اور ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ یہ نام کا مسلمان، مجھ سے محبت کے دعوے کرنے والا میرے احکام کو کس بے دردی سے پامال کر رہا ہے اور خدا و ند قہار و جبار دیکھ رہا ہے کہ میرے اور میرے محبوب کے ارشادات کو پرکاہ وقعت نہ دینے والا مذکورہ بالا جرائم کا مرتکب شخص دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے دعوئ اسلام پر بھی قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھائیوں کی طرح زندگی گزارنے کے دنیوی فائدوں ہی کی سمجھ عطا فرما دے تو شاید ہم اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکیں۔

دنیا کی لذت اور رنگینی

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْہَا فَیَنْظُرُ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَۃِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کَانَتْ فِی النِّسَآءِ (صحیح مسلم)

حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے، نبیٔ محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا بڑی لذیذ اور رنگین ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا میں حاکم بنا کر دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔ دنیا سے پرہیز کرو اور عورتوں سے پرہیز کرو۔ بنی اسرائیل سب سے پہلے عورتوں ہی کے فتنے میں مبتلا ہوئے تھے۔

سرور ہر دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشادِ گرامی میں دنیا کی لذت اور رنگینی کا ذکر فرمایا کہ یہ دنیا خوبصورت اور دیدہ زیب بھی ہے اور لذیذ بھی۔ جو کوئی اس طرف دیکھے گا، اس میں اپنے لیے دلکشی پائے گا، اس کی خوبصورتی اُسے متاثر کرے گی اور وہ دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کرے گا، جوں جوں انسان دنیا کا نظارہ کرتا جائے گا اور اس کی لذات سے مستفید ہونے کی خواہش کرے گا، اس میں کُھبتا چلا جائے گا اور

آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص دنیا سے پیار کرے گا، وہ اپنی آخرت کو ضرور نقصان پہنچائے گا۔ (مشکوٰۃ)

پھر جو شخص دنیا میں جتنا صاحبِ اختیار ہوگا، جس قدر بڑا اس کے پاس منصب ہوگا، دنیا کی لذتوں اور رنگینیوں سے حظ اُٹھانے کے جس قدر مواقع اسے میسّر ہوں گے ــــــ اتنا ہی وہ علائقِ دنیا میں پھنستا چلا جائے گا۔ کسی نے دنیا کی دلکشی اور خوبصورتی کا بھی احساس کر لیا، اس کی لذتوں سے بھی آشنا ہو گیا تو اب اس کی خواہش ہوگی کہ وہ اس سب کو حاصل بھی کر لے۔ اگر اسے یہ اختیار بھی مل جائے تو وہ ساری دنیا اپنے لیے سمیٹ لینا چاہے گا۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ خداوند قدوس تمہیں دنیا میں حاکم بنا کر دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اسلام میں حاکمیتِ حقیقی تو خداوند تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ یہاں تو انسان محض اس کا ایک حد تک نائب ہوتا ہے کہ اس کے احکام کو قانونی شکل دے اور ان پر عمل کرائے۔ جب تک وہ خدا اور رسولِ خدا (جل وعلا وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام پر عمل کرتا اور کراتا ہے، ان احکام سے سرِ مُو سرتابی نہیں کرتا، اسلام کے مقرر کردہ اوامر و نواہی کو نافذ کرتا ہے ــــــ مسلمانوں پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کا معنی یہی ہے کہ پہلے اللہ اور اس کے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور پھر "صاحب امر" کی اطاعت۔ جو شخص اللہ و رسولؐ کی اطاعت میں کامل ہے، وہی 'صاحب امر' ہے اور جب تک وہ اس اطاعت کے احاطے میں ہے، اس قابل ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی لیے عہدے کی طلب اور اس کا لالچ اسلام میں ممنوع ہے اور

طلبِ منصب اُمیدوار کی نااہلیت کی دلیل ہے۔ بخاری شریف میں ہے، سرکارؐ نے فرمایا جو شخص اس کی خواہش رکھتا ہو اور اس کا لالچ رکھتا ہو، ہم اسے حاکم نہیں بناتے۔

ایسے میں حضور حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء کا یہ فرمان کہ خدا تعالیٰ حاکم بنا کر دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسے کام کرتے ہو ــــــ اس حقیقت کی نشان دہی ہے کہ کہیں تم دنیا کی لذتوں اور رنگینیوں میں نہ کھو جاؤ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو گویا تم نے اس منصب کے لیے اپنی نااہلی ثابت کر دی۔ تمہیں تو کہا گیا تھا کہ تم خدا و محبوبِ خدا کے احکام پر عمل کرو گے اور عمل کراؤ گے۔ اس کے بجائے تم علائقِ دنیا میں پھنس گئے تو دنیا و آخرت میں اپنی ناکامی کا گویا ثبوت پیش کر دیا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے تو دنیا کی رنگینی اور لذت کا ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا کہ خدا تعالیٰ اس دنیا کی حاکمیت دے کر تمہیں آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتا ہے کہ تم اس امتحان میں پورے اترتے ہو یا نہیں۔ تم اس اہم حیثیت میں کس انداز میں کام کرتے ہو۔ ساتھ ہی واضح رہنمائی فرمائی کہ دنیا سے اور عورتوں سے بچو۔ دنیا کی لذتوں اور رنگینیوں سے پرہیز کرنے کی اور عورتوں سے پرہیز کرنے کی تلقین فرمائی۔ کہ اگر حاکم بننے کی صورت میں تم دنیا کی رنگینیوں اور لذتوں میں گم ہو گئے تو خدا اور رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو گے اور اگر عورتوں سے نہ بچے تو بھی یہی صورت ہوگی۔

زیرِ نظر حدیث پاک میں، پہلے کھانے اور دیکھنے کے حوالے سے دنیا کی دلکشی کا ذکر فرمایا گیا، آنکھ اور زبان کے نقطۂ نظر سے دنیا کی خوبصورتی کا تذکرہ ہوا

یہ دلکشی تو ہر شخص کے لیے ہے۔ ایک صاحب جاہ و منصب شخص بھی دیکھنے اور دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک عامی بھی۔ دونوں کے لیے اپنے اپنے دائرے میں ان دونوں صلاحیتوں کے اعتبار سے دنیا میں غرق ہونے کی گنجائش ہے۔ لیکن جب کوئی شخص حاکم بن جاتا ہے تو اس کے لیے نسبتاً بہت زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اسی لیے سرکارؐ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ تمہیں حاکم بنا کر دیکھنا چاہتا ہے، یہ مقدس امانت تمہارے سپرد کر کے وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اس کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کے دائرے سے کہیں باہر تو نہیں نکل جاتے، خود بھلائیوں کو شعار کرتے ہو اور دوسروں کو بھلائیوں کا حکم دیتے ہو یا نہیں۔ خود برائیوں سے بچتے ہو اور لوگوں کو برائیوں سے منع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہو یا اس میں کوتاہی کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر کہیں خدا اور رسولؐ کو بھول تو نہیں جاتے، دنیا کے اور عورتوں کے فتنے میں مبتلا تو نہیں ہو جاتے۔

دنیا ہمیشہ سے بڑی پُر فریب رہی ہے، ہمیشہ سے انسانوں کی آنکھیں اس کی چمک دمک سے چکا چوند ہوتی رہی ہیں۔ سائنسی ترقی اور مادی کوششوں نے دنیا کی خوبصورتی اور دلآویزی میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے سہولتیں بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔ سہولتوں نے لوگوں کی تن آسانی کو رواج دیا ہے۔ دنیا پہلے بھی بہت رنگین اور لذیذ تھی، اب تصنع، رکھ رکھاؤ، فیشن اور دیگر سہولتوں نے اس کی رنگینیوں اور لذّتوں میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ عورتوں کے فتنے کو عریانی اور "بیباپوتی" نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ بے پردگی اور عریانی عام ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی تہذیب اور

بے خدا معاشروں نے مرد و زن کے بے حجابانہ اور آزادانہ اختلاط کی راہیں کھول دی ہیں۔ گانے ناچنے کو "ثقافت" کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس طرح عورتوں کا فتنہ مزید "قاتل" ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ہم ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ اگر ہم مسلمان کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ خدا اور رسولِ خدا (جل وعلاہٗ وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے سرتابی کا گمان بھی دل میں نہ لائیں اور اپنے آپ کو دنیا اور عورت کے فتنوں سے بچائیں۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث پاک کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل سب سے پہلے عورتوں ہی کے فتنے میں مبتلا ہوئے تھے۔ افراد ہوں یا قومیں، جب وہ عورتوں کی رنگینیوں میں کھو جاتے ہیں، ان کے قرب کی خواہش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو باقی سب بُرائیاں اور خرابیاں بھی ان میں در آتی ہیں اور اس طرح ان کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

اگر ہم من حیث الجماعت تباہی کے گڑھے میں گرنا نہیں چاہتے، اگر ہم اپنے آپ کو برباد کر دینے کے خواہشمند نہیں ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ دنیا کی لذتوں اور رنگینیوں سے بچیں اور عورتوں کے فتنے سے پرہیز کریں۔ ہم میں سے جس جس کو کسی حیثیت سے حاکم بنایا گیا ہے، ہم یہ سوچ کر ہر عمل کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لے رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں۔

حکومت کے حصول کی طلب و کوشش

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا (صحیح بخاری)

حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبدالرحمن! حکومت طلب نہ کرو۔ اگر تم نے یہ چیز مانگ کر لی تو تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر طلب کے بغیر تمہیں حکومت کرنے کا موقع ملے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔

اسلام میں حکومت کرنے کا اصل حق تو صرف خداوند تعالیٰ کا ہے، حاکم حقیقی تو وہی ہے۔ اس کے احکام کو نافذ کرنا اور ملک میں نظام عدل اور اسلام کا نظام کفالت جاری کرنا اس شخص کی ذمہ داری ہے جسے اس منصب کے لیے چنا جائے۔ خود سے حکومت کرنے کی خواہش اسلام میں جائز نہیں ہے۔ یہ تو اختیار حاصل کرنے کی تمنا ہے اور اختیار تو صرف مالک و حاکم حقیقی کا ہے۔ اسی لیے حضور سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو

فرمایا کہ حکومت طلب نہ کرو۔ یہ بھی فرمایا کہ اگر تم نے مانگ کر حکومت حاصل کی خود خواہش کر کے اس حیثیت میں پہنچے تو تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور خدا کی نصرت تمہارے شامل حال نہیں ہوگی۔

کسی شخص نے حکومت کرنے کی خواہش کی، اس کے لیے تگ و دو کی اور بالآخر اسے حاصل کر لیا تو اگرچہ اس کا مقصد نیک ہی ہو، وہ دنیا میں یا کسی خاص مملکت میں خدا تعالیٰ کا قانون ہی نافذ کرنا چاہتا ہو، معاشرے میں نیکیوں ہی کو فروغ دینے کی خواہش رکھتا ہو، اپنی ذات کے لیے جاہ و منصب کی تمنا اس کے دل میں نہ بھی ہو، تو بھی خدا تعالیٰ کی مدد اس کو میسر نہ ہوگی۔ اسے حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا، وہ اپنی کوشش اور ہمت سے معاشرے کی بہبود اور اسلام اور اسلامیوں کی بہتری کے لیے جو کرنا چاہتا ہے، کرے۔ اگر کامیاب ہو گیا اور جاہ و حشم اور منصب و مرتبہ کے علائق میں گرفتار نہ ہوا اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو گیا، اپنے زیر نگرانی امور کی جوابدہی اور مسئولیت میں سرخرو ہوا تو ٹھیک۔ بصورت دیگر دوزخ کا ایندھن بنے گا۔

جو آدمی حکومت حاصل کرنے کی تمنا کے پس منظر میں اپنی ذاتی وجاہت و جلالت کو نافذ کرنا چاہتا ہو، حکومت حاصل کر کے اپنے لیے کچھ کرنے کی تمنا رکھتا ہو، جاہ و منصب اور مرتبے کے ہوکے میں مبتلا ہو۔ اس خواہش کے پیچھے اس شخص کے دل میں نظام اسلام کی جزئیات کے اجراء و نفاذ کا خیال نہ ہو، تو آغاز سے انجام تک اس شخص کا تمام عمل غیر اسلامی ہوگا۔

حضور محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثناء نے فرمایا کہ جس مسلمان کو طلب اور خواہش کے بغیر حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے، اگر وہ عامۃ الناس کو نظام اسلام کی برکات سے مستفید و متمتع کرنے کی آرزو رکھتا ہے، معاشرے میں

صحت مند رجحانات پیدا کرنا چاہتا ہے، اخوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے
کوشاں ہے تو خداوندِ کریم اس کی مدد کرے گا اور اسے اس امتحان میں سرخرو
کرے گا۔

اگر کسی کو طلب و تمنا کے بغیر بھی حکومت ملے یا حکومت کا کوئی منصب
ملے اور وہ خدا اور رسولِ خدا کے احکام کے مطابق نہ چلے، اس کا رویہ اسلامی
اصولوں کے مطابق نہ ہو، وہ محض اپنے منصب و مرتبہ کو بچانے اور قائم رکھنے
یا اس سے اپنی ذات اور اپنے اعزہ اقربا اور اپنے گروہ والوں کے لیے مراعات
حاصل کرنے یا جمع کرنے میں مشغول ہو جائے تو خدا تعالیٰ اس کی مدد نہیں فرمائے
گا اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو خدا اور رسولؐ کے نافرمانوں کے ساتھ
ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں ہے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکم تو صرف اللہ تعالیٰ
ہی کا ہے، حاکم تو وہی خدائے وحدہٗ لاشریک ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے"جس
کسی نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو ایسے لوگ
کافر ہیں"۔ یعنی جس کسی کو منصب و مرتبہ مل گیا اور اس نے اللہ کے احکام
سے روگردانی کی، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ مومن کے لیے تو ضروری ہے
کہ وہ ہر مرحلے میں خدا اور رسولِ خدا جل وعلا و صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم،
کے احکام سے سرتابی کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ کرے۔ سورۂ الانفال
میں ہے"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اور اللہ کی مقررکردہ
حدود سے آگے بڑھ جائے تو یقیناً اس کے لیے جہنم کی آگ ہے"۔ سورۂ توبہ
میں ہے کہ "اللہ اور رسولؐ کا حق ہے کہ تم ان کو راضی کرو"۔

دراصل حکم صرف خدا تعالیٰ کا ہے اور اطاعت اللہ اور اس کے رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ضروری ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم عن الخطا
ہیں۔ اُن کا فرمان تو اللہ کا فرمان ہے، ان کی اطاعت ہی اللہ
کی اطاعت ہے۔ ان کی رضامندی ہی میں خدا کی رضامندی ہے۔ اس لیے اطاعت
صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط ہے۔ ان کے علاوہ ہر شخص کی اطاعت
مشروط ہے۔ حاکمِ وقت کی اطاعت اس وقت تک ہے، جب تک وہ خدا کے
احکام سے سرتابی نہ کرے اور رسولِ خدا علیہ التحیۃ والثنا کی اطاعت و متابعت
میں رہے۔ جونہی وہ اس راہ سے بھٹکے، اس کی اطاعت واجب نہیں رہتی۔
بلکہ اس کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہر ضروری اقدام کرنا رعیت کا فرض ہو جاتا ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حکومت کرنا کانٹوں کی سیج پر سونے کی
کوشش کرنا ہے۔ اگر قوم کا اہل الرائے طبقہ کسی شخص کو اس قابل سمجھے اور
حکومت اس کے سپرد کر دے یا حکومت کا کوئی منصب اسے دے دے تو اس
کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر باحتیاط چل کر اپنے
آپ کو اس امتحان میں سرخرو کرنے کی کوشش کرے اور ہر وقت خداوندِ تبارک
وتعالیٰ سے رہنمائی اور نصرت طلب کرے کیونکہ اس کے بغیر اس کی کامیابی
مشکوک ہوگی۔

مسلم شریف کی ایک حدیث پاک میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص حاکم،
نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک کو قیامت کے دن اس چیز کے بارے میں
خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے، جو اس کے زیرِ انتظام یا زیرِ نگرانی ہے۔ اس
حدیثِ پاک میں مرد، عورت، بیٹے، خادم، ہر صاحبِ منصب، ہر صاحبِ اقتدار
اور امیرِ حکومت سب کی مسئولیت کا ذکر ہے ———— حکومت کا سربراہ یا
اعیانِ حکومت تو ایک بڑے معاشرے کی فلاح وبہبود کے نگران ہوتے ہیں

اور ان کی ذمہ داری کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور اس حکم کی عمومیت ظاہر ہے یعنی یہ سب مسلمانوں کے لیے ہے کہ کوئی مومن حکومت طلب نہ کرے۔ اگر وہ اپنی تمنا اور طلب کے ذریعے حکومت حاصل کرے گا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور جس کو خدا تعالیٰ کی نصرت حاصل نہیں ہوگی، وہ اتنے بڑے مرحلے سے کامیابی اور سرخروئی کے ساتھ گزر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے فرمایا کہ اگر تمہاری طلب یا کوشش کے بغیر تمہیں حکومت ملی تو خدا تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تم اس کی اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں معاشرے کی فلاح وبہبود اور اسلامی اصولوں کے نفاذ کے لیے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکو گے۔

دراصل جو شخص جانتا ہے کہ حکومت کرنا کتنی بڑی ذمہ داری اور کتنی مشکل آزمائش ہے، وہ خود خواہش کرکے اسے حاصل نہیں کرتا۔ حکومت کرنے کی خواہش میں مارے مارے پھرنے والے جہنمی ہیں، اسی لیے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہم اس آدمی کو حاکم نہیں بناتے جو حکومت کا طالب ہو اور اس کا لالچ کرتا ہو" (بخاری۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت)

مُفلس کی تعریف

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ، قَالُوْا اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْھَمَ لَہٗ وَلَا مَتَاعَ فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِصَلَاۃٍ وَّصِیَامٍ وَّزَکٰوۃٍ وَّیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ ھٰذَا وَقَذَفَ ھٰذَا وَاَکَلَ مَالَ ھٰذَا وَسَفَکَ دَمَ ھٰذَا وَضَرَبَ ھٰذَا فَیُعْطٰی ھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ وَھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُہٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْہِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاھُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْہِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ (صحیح مسلم)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا، تم جانتے ہو، مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا، ہم میں مفلس اس آدمی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس نہ رقم ہو، نہ سامان۔ حضورؐ نے فرمایا، میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لائے گا اس کے باوجود اس نے دنیا میں، کسی کو گالی دی، کسی پہ زنا کی تہمت لگائی،

کسی کا مال غصب کیا، کسی کو قتل کیا، کسی کو مارا پیٹا۔ اس کی نیکیوں کا ثواب مظلوموں کو دیا جائے گا۔ اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور مظلوموں کے حقوق مجروح ہوئے تو پھر مظلوموں کے گناہوں کو اس کے اعمال نامے ہیں جمع کر کے اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ امی و ابی) نے پہلے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے پوچھا کہ مفلس کون ہوتا ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ سرکار! ہم میں مفلس اُس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس مال و دولت نہ ہو اور سامانِ زیست بھی نہ ہو ـــــــ یہی افلاس کی عام تعریف ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جس شخص کے پاس کھانے پینے پہننے کے لیے موزوں چیزیں نہ ہوں اور اسے رقم میسر نہ ہو، وہ مفلس کہلاتا ہے۔ حضور سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی اُمّت کے مفلس کی جو تعریف کی، اس سے حقوق العباد کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حقوق اللہ سے کہیں زیادہ پوچھ گچھ حقوق العباد کی ہوگی۔ اگر ہم نے عبادت کرنے میں تو احکامِ خداوندی اور شریعتِ محمّدی کے مطابق عمل کیا ہوگا، ہمارے ماتھوں پر تو سجدوں کے نشان ہوں گے، ہماری راتیں خدا کی عبادت میں کھڑے کھڑے گزری ہوں گی، ہم نے فرض روزوں کے ساتھ ساتھ نفلی روزوں کا بھی بہت اہتمام کیا ہوگا ـــــــ لیکن کسی انسان کو نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کو دکھ دیا ہوگا اور ان خصائل کو اپنانے میں کمزوری دکھائی ہوگی جو اخوتِ اسلامی کے حوالے سے ہمارے لیے ضروری قرار دیے گئے ہیں ـــــــ ایسا ہوگا تو ہم بارگاہِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں مفلس سمجھے جائیں گے۔

باعثِ ظہورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ میری اُمت میں

مفلس وہ شخص ہے جس کی فردِ عمل میں عبادات کا وافر ذخیرہ ہو، اس نے نمازیں ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی ہو، رمضان کے روزے رکھے ہوں، نفل روزوں کا بھی اہتمام کیا ہو، زکوٰۃ ادا کرنے میں بھی خدا اور رسولِ خدا (جل شانہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کیا ہو۔ غرضیکہ ہر طرح کی عبادت ٹھیک اُسی احتیاط اور التزام کے ساتھ ادا کی ہو، جس کا حکم دیا گیا ہے لیکن حقوق العباد ادا کرنے میں کوتاہی کا مرتکب ہوا ہو۔

حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ قیامت کے دن جو آدمی اپنے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ کے اعمالِ حسنہ لائے گا لیکن اس کے نامۂ اعمال میں کسی انسان کے ساتھ زیادتی کا اندراج ہوگا ـــــــ اس نے جس انسان کے ساتھ ظلم کیا ہوگا، اس کی نیکیاں مظلوم کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی۔ اس طرح حساب بیباک ہو گیا تو ٹھیک، ورنہ مظلوموں کی غلطیاں اور ان کے گناہ بھی اس شخص کے کھاتے میں جمع کر دیے جائیں گے، جس نے ان کا حق غصب کیا ہوگا۔

محبوبِ خالقِ ارض و سما (علیہ التحیۃ والثنا) نے مثال کے طور پہ کچھ گناہ گنوا بھی دیے ہیں جو حقوق العباد کے منافی ہیں۔ فرمایا کہ ایک عابد و زاہد اپنے ساتھ عبادتوں کا ذخیرہ لے کر قیامت کے میدان میں آئے اور اس نے کسی انسان کو گالی دی ہو، یا کسی پہ زنا کی تہمت لگائی ہو، کسی کو ناحق قتل کیا ہو یا کسی کو زد و کوب کرنے کا جرم کیا ہو ـــــــ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس کی نیکیوں کا ثواب ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جن کے ساتھ وہ زیادتی کا مرتکب ہوا تھا۔ سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے فرمایا کہ اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور مظلوموں کے حقوق باقی رہے تو مظلوموں کے گناہ بھی اس کے کھاتے میں جمع کر دیے جائیں گے اور اسے جہنم کی نذر کر دیا جائے گا، وہ آگ میں جلے گا۔

اس حدیث پاک میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حیثیت کی تعیین بھی کر دی گئی ہے۔ ایک مسلمان پر پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے، اس کے لیے روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح پہلی قوموں پر کئے گئے تھے، اس کے مال کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ ایک خاص شرح پر ہر سال اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرے، اسے یہ تمام فرائض ادا کرنا ہیں لیکن اگر کوئی شخص اس زعم میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی عبادت کا اہتمام کرنے کے بعد کوئی اور ضروری کام اس کے کرنے کا نہیں رہا، تو وہ سخت غلطی پر ہے اور اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اسلام کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں ہر شخص دوسرے کے ساتھ محبت کا رشتہ رکھتا ہو سب مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کے اسلامی تعلق میں بندھے ہوں۔ بخاری و مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آقا حضورؐ نے فرمایا کہ اہل ایمان ایک جسم انسانی کی طرح ہیں کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہو تو سب اعضا اس تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں کوئی شخص عبادت کا التزام و اہتمام تو کرے لیکن خدا اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام سے صرف نظر کرے، جو انہوں نے ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لیے اخوتِ اسلامی کے لوازم کے طور پر کرنے کے لیے دیے ہیں ——— تو ایسا شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر نظر فرمان کا مطلب یہ ہے کہ صرف عبادت انسان کو لے ڈوبے گی، اگر اس نے حقوق العباد ادا نہ کیے۔ اگر اس نے کسی کو گالی دی، یا اس کی غیبت کی یا اس کا

مال غصب کر لیا یا کسی کا حق نہ دیا، یا کسی کو قتل کر دیا یا اسے مارا پیٹا، یا کسی کو تہمت کا نشانہ بنایا۔ اگر اس نے عبادت تو کی لیکن ماں باپ کو "ہوں" بھی، انہیں جھڑکنے کا جرم کیا، ان کے ساتھ احسان نہ کیا، ہمسائے کو تکلیف پہنچائی، خادم کے ساتھ ظلم اور زیادتی روّیہ رکھا، لوگوں کے ساتھ نفرت اور عداوت کا روّیہ رکھا، بُغض، حسد، بدگمانی اور شماتت میں مبتلا ہوا، کسی کے ساتھ بدزبانی کی، کسی کی چغل کھائی، غیبت اور بہتان کا مرتکب ہوا، جھوٹ بولتا رہا، جھوٹی قسمیں کھائیں، جھوٹی گواہی دی یا اور کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کیا جس سے اسلام نے منع کیا ہے اور اس کا تعلق معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا کرنے سے ہے اور کسی انسان کو تکلیف دینے سے ہے۔ ایسا شخص نیکیوں کا انبار ساتھ بھی لایا تو اپنے افلاسِ اخلاق کی وجہ سے مارا جائے گا۔

دولتمندی کیا ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کے اسباب اور سامانِ زیست کی کثرت کا نام دولت مندی نہیں۔ اصل دولت مندی تو دل کی بے نیازی او رغنا ہے۔

ہم ہر روز امیر غریب کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس مال و دولت کی کثرت ہے، اسباب دنیوی کی فراوانی ہے، وہ دولت مند کہلاتے ہیں اور جن کے پاس اِن چیزوں کی کمی ہو، وہ مفلس اور غریب کہلاتے ہیں۔ لیکن حضور حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے مفلس اور دولت مند کی تعریف مختلف فرمائی ہے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس مال و دولت اور سامانِ زیست کی فراوانی ہو، وہ غنی نہیں ہے۔ غنی وہ ہے جس کا دل دنیا کے اسباب سے غنی اور بے نیاز ہو۔

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، سرکارؐ نے فرمایا کہ جسے آخرت کی زیادہ فکر ہو، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی

کر دیتا ہے اور جو شخص دنیا کے عیش پر مرمٹنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس پر محتاجی مسلط کر دیتا ہے یعنی جس آدمی کو آخرت کی زیادہ فکر ہوگی، اس کا دل دنیا کے مال و اسباب اور تعیشات سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر حدیثِ پاک کی رُو سے دولت مند وہی شخص ہے۔ اور جس آدمی کے پاس دنیا کا مال ہو، اسباب زیست کی کثرت ہو، اسے اگرچہ ہم دنیا دار لوگ امیر یا دولتمند کہتے ہیں لیکن آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ مبارک کی رُو سے وہ دولت مند نہیں، بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ نے محتاجی مسلط کر دی ہے اور وہ دولت کا بھوکا ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ لوگ اسے دولت مند، باثروت اور امیر کہتے ہیں لیکن اس کا اپنا یہ حال ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دولت والوں کی طرف دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ خود اس کے پاس کم دولت ہے، اور زیادہ ہونی چاہیے۔ "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" اس کی زبان کا غازہ ہوتا ہے اور وہ دنیا کا "فقیر" ہو جاتا ہے کہ ہر وقت دنیا ہی کی طلب میں اس کا کشکولِ ہوس وا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے محتاجی کی اس منزل پر پہنچا دیتا ہے کہ اسے ہر وقت مزید دولت کمانے اور اسبابِ زیست مہیا کرنے کی فکر لاحق رہتی ہے اور اس کی احتیاج پوری نہیں ہوتی۔

کائنات کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور حدیثِ پاک میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص دنیا سے محبت کرتا ہے، اس کی آخرت کو ضرور ضرر پہنچتا ہے اور جو آدمی آخرت سے پیار کرتا ہے، اس کی دنیا ضرور متاثر ہوتی ہے —— اگر کوئی انسان آخرت سے محبت کرتا ہو تو اسے خدا اور رسول خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات و احکام کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ وہ ذخیرہ اندوزی نہیں کر سکتا، احتکار و اکتنازِ زر کا جرم اس سے سرزد

نہیں ہو سکتا، ماپ تول میں کمی کا ارتکاب وہ نہیں کرتا، ناجائز کمائی کا تصور اس کا ساتھی نہیں بنتا۔ اس کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ وہ دیتا ہے، صدقات و خیرات کی اہمیت اسے معلوم ہے، اپنے والدین، اقربا اور دوسرے مستحقین کے ساتھ حُسنِ سلوک اس کا وطیرہ ہوتا ہے۔ اسے علم ہے کہ سامانِ تعیّش جسے اللہ اور اس کے رسولِ پاک نے منع فرمایا ہے، وہ اس کے نزدیک نہیں جاتا۔ ایسا شخص ہی دراصل غنی ہے کہ اس کے دل کو خداوندِ کریم نے دنیا، اس کے اسباب اور مال و دولت کی دنیوی اہمیت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس شخص کو آخرت پیاری ہوتی ہے، اس لیے دنیا کی طرف سے وہ بے نیاز کر دیا جاتا ہے اور اس کی دنیا کو ضرر پہنچتا ہے۔

اس کے برعکس جو آدمی دنیا کمانے میں لگا ہو۔ اس کے دن رات اس فکر میں گزرتے ہوں کہ وہ کس کس ذریعے سے کتنا زیادہ سے زیادہ کما سکتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کمائی کے جائز اور ناجائز ہونے کی کوئی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ جو آدمی اس تفریق کو اہمیت دیتا ہو، اللہ اس کو دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے اور وہ زیادہ دنیا کما ہی نہیں سکتا۔ دنیا سے محبت کرنے والا شخص بظاہر لوگوں کو دولت مند اور باثروت نظر آتا ہے، لوگ اسے دولت مند سمجھتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایسے محبِ دنیا کی آخرت کو ضرور ضرر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر محتاجی وارد کر دیتا ہے۔ لوگوں کے نزدیک اس کے پاس بہت زیادہ دولت ہے، لیکن وہ دولت کی بھوک میں مبتلا ہے اور شبانہ روز یہ سوچتا ہے کہ مزید دولت کس طرح کما سکتا ہے۔ اس کی یہ احتیاج اس کی آخرت کا نقصان کر دیتی ہے۔

حضور رسولِ خدا علیہ التحیۃ والثنا نے اہلِ ایمان کو حکم فرمایا ہے کہ دنیا کے

کسی لالچی کو دولت مند نہ سمجھیں۔ اصل دولت مندی تو دل کی بے نیازی اور "غنا" ہے ـــــــ دل کا غنی دنیا کے اسباب کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ اس کے پاس دولت آگئی ہے تو بے حیثیت ہے، دولت مند نہیں تو کوئی پریشانی نہیں۔ دل کا غنی اسبابِ حیات کے فقدان یا کمی پر ملول و مضطرب نہیں ہوتا، مال و دولت کے ڈھیروں اور ذخیروں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے پاس مال آجائے تو غریبوں، مسکینوں اور حقداروں میں بانٹ دیتا ہے خود بھی اس سے مستفید ہوتا ہے لیکن اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق۔ اگر اس کے پاس مال زیادہ نہ ہو تو بھی وہ خدا و رسولؐ کے احکام سے صرفِ نظر نہیں کرتا، مال و دولت والوں کی طرف حسد یا رشک سے نہیں دیکھتا۔ صرف اللہ و رسولؐ کو خوش کرنے اور اپنی عاقبت سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔

جو شخص، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دولت مند اور غنی ہے، وہ کسی پرلا اور ٹا کو خاطر میں نہیں لاتا، بڑی بڑی سلطنتوں اور جاہ و حشم والوں کی اس کی نگاہ میں کوئی وُقعت نہیں ہوتی، وہ تنگدستوں کا ساتھی ہوتا ہے، غریبوں سے محبت کرتا ہے، اسے انسانیت سے ہمدردی ہوتی ہے، وہ اپنی آخرت سنوارتا ہے، اس کی دنیا کو لازماً ضرر پہنچتا ہے۔ اور جو آدمی دنیا کے اسباب کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے، مال و دولت کی اشتہا جس کی خصوصیت بن جاتی ہے، جو سامانِ زیست کی کثرت کا خواہاں ہوتا ہے، وہ اپنے سے بڑے مال و دولت کے پُجاری کو حسد کی نظروں سے دیکھتا ہے، غریبوں سے اُسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ انسانیت کی محبت اس کے دل میں گھر نہیں کر سکتی، وہ دن رات اپنی دنیا سنوارنے کی خواہش اور کوشش

میں اپنی عاقبت خراب کر بیٹھتا ہے۔ وہ بُخل و حرص کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے نہایت بُرا گردانا ہے۔ وہ احتکار اور اکتنازِ زر کا مرتکب ہوتا ہے، جس پر قرآن و احادیث میں بہت وعیدیں آئی ہیں۔ وہ زکوٰۃ، صدقات، خیرات کو بھی محض ریاکاری کے احساس سے استعمال کرتا ہے، جو مال کو پاک نہیں کرتیں بلکہ اس ریاکار کے گناہوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایسا آدمی دولتمند نہیں، دنیا کا بھوکا ہے، محتاجی اس کا مقدر کر دی گئی ہے۔ جس آدمی کا دل خواہشِ زر و مال سے خالی اور اسبابِ دنیا سے بے نیاز ہو، دولت مند وہ ہے۔

اخراجات میں میانہ روی

اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ

مشکوٰۃ شریف میں بیہقی کے حوالے سے حضرت عبداللہ ابنِ عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے، حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ اخراجات میں میانہ روی آدھی معیشت ہے۔

آج کل معیشت پوری دنیا میں مسئلہ بنی ہوئی ہے حتیٰ کہ مسلمانوں میں میں بھی کئی لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں کہ وہ کسی یہودی یا نصرانی کے افکار سے استفادہ کریں یا کوئی بے خدا انظام اپنا کر اس کے معیشی نظریات کے ذریعے اس مسئلے کو حل کر لیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوچ کے یہ انداز خدا و رسولِ خدا کے احکام و ارشادات کو نہ جاننے کا نتیجہ ہے ورنہ جس دین میں کمائی کے بھی طریقے متعیّن ہوں اور خرچ کی بھی حدود مقرر ہوں، جہاں غلط اور ناجائز ذرائع سے دولت کمائی بھی نہ جا سکتی ہو اور عیش و عشرت کے سامان اور غلط کاموں پر خرچ بھی نہ کی جا سکتی ہو —— وہاں معیشت کے مسائل پیدا ہی کہاں ہو سکتے ہیں۔

ایسے طریقوں سے دولت کمانا اسلام میں جائز نہیں جن سے خدا و رسول (جل شانہ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی

ہو یا ملت، ملک یا معاشرے کو اجتماعی طور پر یا دوسرے افراد کو انفرادی طور پر نقصان پہنچ سکتا ہو، یا ایسے تجارتی طریقے جن میں کسی ایک فریق کا فائدہ یقینی ہو اور دوسرے فریق کا فائدہ مشکوک ہو یا اتفاق سے اور راتوں رات امیر بن جانا پیش نظر ہو ـــــ اسی طرح ایک مسلمان خرچ بھی حلال اور جائز طریقوں سے کرنے کا پابند ہے، اس کی کمائی بھی حلال ذریعوں سے ہو سکتی ہے، دولتِ دنیا کی حرص وہوس بھی اس کے لیے ممنوع ہے، وہ دولت اکٹھی نہیں کر سکتا۔ سورۃ التکاثر میں ہے "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے گھیر رکھا ہے، قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں رہتے ہو۔ یہ ہرگز تمہارے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔ جلد ہی تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔" سورہ التوبہ میں ہے "جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے۔" اور مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خرچ بھی جائز ضرورتوں پر کرے ـــــ جب کوئی شخص ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی تجوریاں نہیں بھر سکتا تو اس معاشرے کے خوشحال ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے اور ایسے معاشرے میں معیشت کے مسائل جنم ہی کیسے لے سکتے ہیں۔

زیرِ نظر حدیث پاک میں حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخراجات کے حوالے سے میانہ روی شعار کر لینے کو نصف معیشت قرار دیا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ اگر ہماری آمدن بھی نیک ذرائع سے ہو تو آدھی معیشت وہ ہے اگر اخراجات میں ہم اسلام کے احکام پر عمل پیرا ہو گئے تو باقی آدھی معیشت کا مسئلہ یوں طے ہو گیا۔ اسلام دینِ اعتدال ہے۔ وہ نہ تو بخل کو پسند کرتا ہے، نہ فضول خرچی کو۔ وہ دونوں کی مذمت کرتا ہے۔ یہاں نہ تو خرچ کرنے میں کنجوسی

سے کام لینے اور دولت سمیٹ کر رکھنے کی گنجائش ہے، نہ غرور اور شان و شکوہ کے اظہار کے لیے اور عیاشی اور دوسرے منع کیے گئے طریقوں پر خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ اپنی ذات پر، اہل وعیال کی ضرورتوں پر، قبیلے کنبے والوں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور قرض داروں پر خرچ کرنا اسلام کی رو سے جائز اور ضروری ہے۔ غرض ہر انفرادی اور اجتماعی جائز ضرورت پر خرچ کرنا صحیح ہے۔ بے جا خرچ اسلام میں باقاعدہ قانون کے تحت بھی منع ہے اور اسلام کا نظامِ اخلاق بھی ایسے راستوں پر چلنے سے روکتا اور نیکی پر، خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر اکساتا ہے۔

حضور آقا و مولا علیہ التحیۃ والثناء نے مصارف میں میانہ روی اور اعتدال کا حکم دیا ہے اور اس ذریعے سے معیشت کے نصف مسائل حل ہونے کی نوید سنائی ہے۔ یعنی نہ ہم بخل سے کام لیں نہ فضول خرچی سے۔ کنجوسی اور بخل سے بہت سی برائیاں اور بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات اس کی وجہ سے خیانت، بددیانتی اور بے مروتی کی بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر بے رحمی، بدسلوکی، حرص، لالچ اور کمینہ پن بھی اس برائی سے جنم لیتا ہے۔ سورہ آلِ عمران میں ارشادِ خداوندی ہے وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ٥ اور جن لوگوں کو خدا نے اپنے فضل سے دیا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں۔ وہ ہرگز اسے اپنے لیے اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے جس میں انہوں نے بخل کیا تھا، عنقریب قیامت کے دن وہ ان کے گلے کا طوق ہو گا اور

اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا، اور اللہ تمہارے کاموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ (۳: ۱۸۰)

مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بُخل سے، سُستی سے، زیادہ بڑھاپے سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ترمذی میں روایت ہے سرکار نے فرمایا، سخی جاہل خدا کو بخیل عابد سے بہت زیادہ پیارا ہے۔ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ دھوکا دینے والا، بخیل اور احسان جتانے والا ان تینوں جنت میں نہ داخل ہوں گے۔ (زادِ صدیق)

کنجوسی کے برعکس فضول خرچی ہے۔ سورۂ انعام اور اعراف میں ہے وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔ فضول خرچی نہ کرو کیونکہ خدا تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بنی اسرائیل میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کے بھائی فرمایا گیا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے حضور رسولِ انام علیہ السلام نے فرمایا۔ کھاؤ، پیو، پہنو اور خیرات کرو، جب تک کہ اس میں فضول خرچی یا تکبر کی آمیزش نہ ہو۔ یعنی نہ تو مال کو اس انداز میں بے دریغ خرچ کیا جائے کہ لوگ مرعوب ہوں، نہ ایسے کاموں پر خرچ کیا جائے جو اسلامی شریعت میں منع کیے گئے ہیں اور نہ اپنے رہن سہن کے معیار کو اتنا بڑھا لیا جائے کہ عیش و عشرت کے ضمن میں آجائے۔

یعنی ہم اپنے اخراجات میں میانہ روی اور اعتدال کو شعار کرلیں، جہاں جہاں خرچ کرنے سے گریز نہ کریں اور جہاں خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے، وہاں اس سے باز رہیں، نہ کنجوسی سے کام لیں، نہ فضول خرچی سے، تو حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ ہماری معیشت کے آدھے مسائل حل ہو جائیں گے۔

دنیا سے محبت یا آخرت سے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق)

حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص دنیا سے محبت کرتا ہے، وہ اپنی آخرت کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے اور جو آدمی آخرت سے پیار کرتا ہے، وہ اپنی دنیا کو ضرر پہنچاتا ہے۔ لوگو، دائمی کو عارضی پر ترجیح دو۔

پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کلمہ گوؤں کو دنیا طلبی کے بجائے حُسنِ آخرت کی خواہش کے تحت زندگی گزارنے کی تلقین فرمائی ہے۔ سرکارؐ نے واضح طور پر فرما دیا کہ اگر کوئی شخص دنیا سے پیار کرے گا، علائقِ دنیا میں پھنسا رہے گا اور حُسنِ آخرت کے پیشِ نظر زندگی نہیں بسر کرے گا تو اس کی آخرت ضرور خراب ہوگی، وہ دنیا کمانے میں معروف رہے گا اور آخرت میں اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن جو شخص اپنی زندگی اس نقطۂ نظر سے گزارے گا کہ وہ اپنی آخرت کے لیے کچھ کرلے، اسے اُخروی زندگی سے پیار ہو گا، تو وہ اپنی دنیا کو نہیں سنوار سکتا۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے، فنا ہونے والی ہے، جبکہ اُخروی زندگی دائمی ہے، اسے فنا نہیں، وہ باقی

رہے گی۔ اس لیے حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے نام لیواؤں کو
ہدایت دی ہے کہ وہ عارضی زندگی کو سنوارنے کی خواہش میں اپنی دائمی زندگی
کو خراب کرنے کا خطرہ مول نہ لیں۔ بلکہ فنا نہ ہونے والی زندگی سے محبت کریں
اور اس حُبِّ آخرت میں ان کی دنیا بگڑتی ہے اور اسے نقصان پہنچتا ہے، تو
اس کی پروا نہ کریں۔

کوئی شخص دنیا سے محبت کرتا ہے تو اسے مال و منال سے پیار ہوتا ہے،
اسے اپنے بیوی بچوں سے اس حد تک لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ ان کی خوشحالی کے
لیے جائز، ناجائز ہر طریقے سے کمانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ جاہ و حشمت،
عہدوں اور ثروت کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس طرح
اس کی آخرت کی خرابی یقینی ہوتی جا رہی ہے۔

جب کوئی آدمی حصولِ دنیا میں غرق ہو جاتا ہے تو اس کے لیے خدا و
رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام و ارشادات پر عمل مشکل
ہو جاتا ہے۔ حسد، کینہ اور بغض کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ
اپنے ہم چشموں میں "بڑا" بننے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتا ہے۔
کمائی کے جو جائز طریقے اسلام نے بتائے ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھنا ایسے آدمی
کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو دنیا میں اپنی حیثیت بنانے کے زعم میں زیادہ سے
زیادہ کمانے کی فکر میں مبتلا ہو۔ اسلام نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن طریقوں سے
کمانا ہے اور خرچ کے طریقے کیا ہیں، لیکن کمائی اور خرچ کے ان طریقوں کا خیال
تو وہی آدمی کرتا ہے جو اپنی آخرت سنوارنا چاہتا ہو۔ جسے اپنی آخرت کا خیال
نہ ہو اور وہ اپنی دنیا بنانا چاہتا ہو، وہ آمدن اور خرچ کی ان حدود کا احساس
کیوں کرے گا۔

جسے دنیا سے محبت ہو گی، وہ زمین سے محبت کرے گا اور مال و دولت
کو چاہے گا، عورتوں کے جال میں پھنسے گا۔ اس طرح زر، زن اور زمین سے تعلق
اس کی آخرت کو خراب کر دے گا۔ جو دنیا سے پیار کرتا ہے، اس کے لیے بیوی بچوں
کی پرورش و پرداخت کے حوالے سے قرآن و احادیث میں مرقوم ہدایات کی
پابندی مشکل ہو جائے گی۔ وہ اپنے اہلِ خانہ کو خوشحال زندگی گزارتے دیکھنے
کی تمنا میں تلاشِ رزق کے حلال یا حرام ذرائع میں تمیز نہ کر سکے گا اور اس طرح
اپنی اُخروی زندگی جو دائمی بھی ہے، برباد کر بیٹھے گا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں
ارشادِ خداوندی ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ
فِيْهَا مَا نَشَآءُ یعنی جو کوئی اس دنیا میں جلدی حاصل ہونے والے
فائدوں کا خواہش مند ہو، اسے ہم یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا
چاہیں۔ (۱۷:۱۸)

دنیا کی محبت کا لازمی نتیجہ خدا کا خوف نہ کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ کے احکام
اور اسلام کی تعلیمات سے صرفِ نظر ہی کی وجہ سے دنیا سے محبت پیدا ہوتی
ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول و محبوب
صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے بھی محبت کریں، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہوں،
——— اور دنیا سے بھی لو لگائیں۔ یہ دو انتہائیں ہیں جو جمع نہیں ہو سکتیں۔
آپ چاہیں کہ آپ کی آخرت اچھی ہو تو آپ کا ہر لمحہ خدا و رسولؐ خدا کی دی
ہوئی ہدایات پر عمل درآمد کا نمونہ ہو گا۔ لیکن اگر آپ اپنی دنیا سنوارنے کے
خواہاں ہوں تو اس خواہش کی تخم ریزی خدا و رسولِ خداؐ کے احکام سے
سرتابی کا نتیجہ ہوتا ہے، آخرت کا نقصان تو اس میں لازمی ٹھہرے گا۔ سورۂ ہود
میں ہے جو لوگ دنیا کی زندگی اور بس اسی کی زینت اور آرائش چاہتے

ہیں، ان کے کاموں کا بدلہ ہم ان کو اسی دنیا میں دے دیا کرتے ہیں اور اس میں
ان کو نقصان نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آخرت کی زندگی میں آگ کے سوا
اور کچھ نصیب نہیں ہوگا۔" (۱۱، ۱۵)

حضورِ نورِ مجسم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص آخرت
سے پیار کرتا ہے، وہ اپنی دنیا کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے، اس کی دنیا نہیں بنتی۔
جیسے خواہشِ دنیا میں مرنے والا اپنی آخرت خراب کر لیتا ہے، اسی طرح آخرت
سنوارنے کا خواہشمند اپنی دنیا نہیں بنا سکتا۔ کوئی آدمی جس وقت اپنی زندگی اس
انداز میں بسر کرتا ہے کہ اس کی آخرت اچھی ہو تو ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنی حیاتِ مستعار
کی تمام گھڑیاں اللہ تبارک وتعالیٰ اور محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء کی متابعت
اور اطاعت میں گزارے۔ ایسے شخص کے لیے دنیا کی رنگینیاں بے کیف
ہو جاتی ہیں۔ وہ دائمی زندگی کی طرف دیکھتا ہے، فانی زندگی کو کوئی اہمیت
نہیں دیتا۔ پھر اس کے بیوی بچے اور اعزہ واقربا اس کو کسی ایسے کام پر نہیں
اکسا سکتے جس سے بچنے کی اسلام تاکید کرتا ہو۔ وہ حرام ذرائع سے مال کمانے
کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کا خرچ خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی
حدود میں ہوتا ہے، اسے زمین اور جائداد سے کوئی تعلقِ خاطر نہیں ہوتا کہ
اس کے لیے کسی کا حق چھیننے یا مقدمے لڑنے یا جھگڑوں لڑائیوں میں پھنسے۔
تعیشات اس کی نظر میں دوزخ کی طرف لے جانے والے عوامل ہوتے ہیں
اس لیے وہ ان کے متعلق سوچتا بھی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کو مال و دولت کی لگن نہ ہو، اسے جاہ ومنصب کا
ہوکا نہ ہو، اسے زمین، مکان اور جائداد کا چسکا نہ لگے، اسے کوئی چیز اس امر پر
نہ اکسا سکے کہ وہ کوئی حرکت خدا اور رسول کے احکام کے خلاف کرے، اس

کی دنیا سنور ہی نہیں سکتی۔ وہ نہ مالدار ہو سکتا ہے، نہ جاہ وحشمت اسے
نصیب ہوگی، نہ وہ اپنے دنیادار اعزہ کا محبوب بن سکتا ہے، نہ اہلِ دنیا کی
نظروں میں اسے وقعت نصیب ہوتی ہے۔ یعنی دنیا اور اس کے متعلقات
ایسے شخص کو کوئی حیثیت دینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔

اس لیے حضور بادشاہِ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ
میں دنیا اور آخرت کے تضاد کی حقیقت بیان فرمادی ہے کہ جو شخص دنیا کا محب
ہوگا، وہ اپنی آخرت کو لازماً نقصان پہنچائے گا اور جو شخص آخرت سے محبت
رکھتا ہے، ضروری ہے کہ اس کی دنیا خراب ہو۔ یہ حقیقت بیان فرمانے کے بعد
سرکارؐ نے اس سے بھی بڑی حقیقت کا اعلان فرمادیا کہ دنیا کی زندگی تو عارضی
اور فانی ہے۔ آخرت کی زندگی دائمی اور باقی رہنے والی ہے۔ اس لیے اہلِ اسلام
کو چاہیے کہ وہ دائمی زندگی سے پیار کریں اور اس کے نتیجے میں اپنی دنیا کو ضرر
پہنچنے دیں۔ ایسا نہ ہو کہ فانی زندگی کی محبت میں دائمی اخروی زندگی کو نقصان
پہنچا بیٹھیں کہ یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا۔

تاجروں اور فاجروں کا حشر

عن عبید بن رفاعة عن ابیه عن النبی صلی الله تعالی علیه وسلم قال التجار یحشرون یوم القیامة فجاراً الا من اتقی وبر وصدق

حضرت عبید بن رفاعہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ ہوگا بجز ان کے جو خدا تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

نبی نذیر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تجارت کے عمل میں خدا سے نہ ڈرنے والوں، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اور جھوٹ بول کر کاروبار کرنے والوں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے کمائی کے ذرائع کے جائز اور حلال ہونے پر زور دیا ہے اور حصولِ معاش کی آزادانہ سعی میں حلال وحرام کی حدیں متعین کر دی ہیں۔ اسلام نے کمائی کے ایسے تمام ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے جن سے خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو اور دوسرے افراد کو یا اجتماعی حیثیت میں پوری ملت، ملک یا معاشرے کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچ سکتا ہو۔ یا ایسے تجارتی طریقے جن میں کسی ایک فریق کا یقینی طور پر فائدہ ہو اور دوسرے فریق کا فائدہ مشتبہ اور مشکوک ہو۔ اتفاق سے، راتوں رات امیر بن جانے کے طریقوں، سٹہ، لاٹری، معمے وغیرہ سے دولت حاصل کرنا اور دھوکے، جھگڑے اور قیاس کے سودے اور انصاف اور مفادِ عامہ کے خلاف ذرائع ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ سود، رشوت، جوا، چوری، سٹہ، خیانت، غصب

وزن، ماپ تول میں کمی، قحبہ گری، شراب اور دوسری منشیات ومسکرات کی صنعت و تجارت، ناجائز منافع خوری، لوٹ مار، مفت خوری، پیشہ ورانہ گداگری اور ظلم و استحصال کے ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی کو اسلام ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے۔ نیز احتکار اور ایسی اجارہ داریوں سے منع کرتا ہے جن کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے مواقع نہ رہیں۔

اسلام نے "مال کی محبت" کو مذموم قرار دیا ہے اور بخل وامساک، زر پرستی، دولت دنیا کی حرص وہوس اور خوشحالی پر فخر وناز کی مذمت کی ہے۔ قرآن پاک میں ہے

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے۔ قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو، یہ ہرگز تمہارے لئے نفع مند نہیں ہے۔ جلد ہی تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا"

(التکاثر ۱-۳)

غرض کہ خالق ومالکِ حقیقی نے تجارت کے حوالے سے مسلمانوں کو جو راہ دکھا دی ہے اس سے صرفِ نظر کرنا عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ جو تاجر خدا سے ڈرنے والے ہیں، وہ احتکار واکتنازِ زر کی ممانعت اور ناجائز ذرائع آمدن پر قدغن کے اسلامی اصولوں کی پیروی کرتے ہیں، حدود اللہ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق جھوٹ سے متنفر ہیں اور جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے۔ جو لوگ کاروبار کرتے ہوئے خدا سے نہیں ڈرتے، تقویٰ کو شعار نہیں کرتے، جلبِ منفعت کی خواہش کو روبہ عمل لانے کے لئے جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں اور سچ کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتے، آقا ومولا علیہ التحیۃ والثناء کے حکم کے مطابق ان کا حشر فاجروں کے ساتھ ہوگا۔

صرف وہی تاجر اللہ کے محبوب ہیں جو تجارت کے سارے عمل میں خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ وہ کوئی چیز خریدتے وقت بھی خوفِ خدا کریں، اس شئے کو رکھتے اور سنبھالتے ہوئے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو خدا اور رسولِ خدا (جل شانہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کو ناپسند ہو اور بیچتے وقت بھی اگر ان کے دل میں کوئی ایسی بات آئے جس سے منع کیا گیا ہے، تو وہ خشیتِ الٰہی کا مرقع بن جائیں۔ اگر خرید کے موقع پر کاروباری آدمی کے دل میں کوئی "بے ایمانی" آجائے یا اس چیز کو سنبھالتے وقت احتکار کا خیال آجائے، وہ اِس انداز میں چیز کو روکے کہ اس پر اس کی اجارہ داری قائم ہو جائے یا وہ اجارہ داری قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو —— یا پھر وہ فروخت کے موقع پر ناجائز کمائے، ملاوٹ کا مرتکب ہو، ماپ تول میں کمی کرے، جھوٹ بولے، جھوٹی قسم کھا کر گاہک کو مطمئن کرنا چاہے تو وہ فاجر ہے، اس کا حشر عبرتناک ہوگا، خدا و رسولِ خدا نے اس کے لیے وعید رکھی ہے۔ دوسری صورت میں حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کمائی کے حلال اور جائز ذرائع میں تجارت کو سب سے پسندیدہ اور اچھے ذرائع میں سے قرار دیا ہے۔

ہمارے بزرگوں میں سے جو لوگ تجارت کرتے تھے، انہیں جہاں کہیں شک بھی پڑ جاتا تھا کہ ان کے کسی ملازم کا کوئی عمل احکامِ اسلام کے منافی ہو سکتا ہے، وہ اس کا ازالہ کر دیا کرتے تھے، ہمیشہ جائز منافع لیتے تھے۔ جب قحط پڑتا تھا، اپنے غلّے کو مہنگا بیچنے کے بجائے مستحقین میں مفت تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اگر انہیں ذرا سا گمان بھی ہوتا تھا کہ ان کے کسی خادم نے کوئی کم قیمت چیز کچھ زیادہ داموں فروخت کر دی ہے تو خوفِ خدا کے باعث اس گاہک کو ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ اس کے زیادہ دیے ہوئے پیسے اسے واپس کر دیں۔ کوئی چیز خریدتے وقت اگر ذرا خیال ہوتا تھا کہ بیچنے والا اپنی لاعلمی کی بنا پر بازار سے کم داموں بیچ رہا

ہے تو اپنے علم یا معلومات کے مطابق اسے جائز رقم زبردستی دیتے تھے تاکہ اس کا نقصان نہ ہو اور خداوندِ کریم اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہ ہو۔

آج کل کی تجارت تو (الاماشاء اللہ) صرف ان "اصولوں" پر قائم ہے جن کے باعث آدمی کا حشر فاجروں جیسا ہو، جن کی وجہ سے خدا اور رسولِ خدا ناراض ہوں، جن سے اپنے بھائیوں کا نقصان ہو، انہیں تکلیف پہنچے، ان کی جیبوں سے زیادہ سے زیادہ رقم نکالی جا سکے۔ آج خریدتے وقت بھی خوفِ خدا معاونت کرتا نظر نہیں آتا، چیز کو رکھتے وقت بھی عامۃ الناس کو لوٹنے اور اپنا گھر بھرنے کی خواہش کے پیشِ نظر ملاوٹ ہوتی ہے، ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے، اجارہ داری قائم کرنے کے لیے کئی کوششیں ہوتی ہیں۔ سٹے اور دوسری حرکتوں کے ذریعے بیٹھے بٹھائے لاکھوں کروڑوں بنائے جاتے ہیں اور اشیاء کی قیمت زمین سے آسمان پر پہنچا دی جاتی ہے جس سے معاشرے کا سکون غارت ہو رہا ہے۔ لوگ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہو رہے ہیں۔ سکون و اطمینان رخصت ہو رہا ہے۔ اور —— اس سب کچھ کے ذمہ دار وہ تاجر ہیں جن کے متعلق حضور حبیبِ کبریا علیہ التحیۃ والثنا نے زیرِ نظر حدیث پاک میں وعید فرمائی ہے۔

اگر ہم اسلام کا نام لیتے ہیں، اسلام کے نام پر یا اپنے نام و نمود کی خاطر یا ریاکاری کی نیت سے کسی رفاہی کام پر کچھ خرچ دیتے ہیں یا کسی مستحق کو کچھ دے دیتے ہیں لیکن ہماری کمائی ان ناجائز طریقوں سے ہوتی ہے جن سے منع کیا گیا ہے یا ہم کاروبار کے پورے عمل میں کہیں جھوٹ کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور خوفِ خدا کو ہر وقت اپنا معاون نہیں رکھتے تو دراصل ہم مخلوقِ خدا کے ساتھ ساتھ خود خدا پاک اور اس کے صاحبِ لولاک محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اس حرکت کا انجام عبرتناک ہی ہوگا۔

———

مال و دولت اور جاہ و منصب کی ہوس

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ
لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ
لِدِيْنِهٖ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور فخرِ آدم و بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو بھوکے بھیڑیے جنہیں بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو، اس آدمی کی طرح تباہی نہیں مچاتے جو مال جمع کرنے اور جاہ و منصب حاصل کرنے کی حرص و ہوس میں مبتلا ہونے کے باعث اپنے دین کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مال و دولت جمع کرنے اور جاہ و منصب حاصل کرنے کی حرص میں مبتلا ہونے والوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ دراصل اپنے دین کا حلیہ بگاڑنے کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی اس سے زیادہ شدت کے ساتھ جس طرح دو بھوکے بھیڑیوں کو اگر بکریوں کے ریوڑ میں کھلا چھوڑ دیا جائے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ ہو تو وہ بکریوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ذرا تصور تو کیجیے کہ دو بھیڑیے بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لیے آزاد ہیں، وہ

بھوکے بھی ہیں اور انہیں روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا وہ کسی ایک بکری کو بھی زندہ چھوڑیں گے۔ وہ تو بکریوں کے اس گلّے کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جتنی تباہی وہ دو بھیڑیے مچاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ وہ آدمی اپنے دین کا نقصان کرتا ہے جو مال جمع کرنے کی ہوس میں مبتلا ہو یا جاہ و منصب کے حصول کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے کوشش کر رہا ہو۔

جس انسان کو مال اکٹھا کرنے کا جنون ہو جائے، وہ اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق سوچنے کا تردّد نہیں کرتا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ رات دن پیسے اکٹھے کرتا رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے امیر سے امیر تر ہوتا جائے۔ اگر آج اس کے پاس چند لاکھ روپیہ ہے تو کل یہ چند کروڑ ہونا چاہیے اور پھر اسی طرح اسے بڑھتے رہنا چاہیے۔ اگر آج ایک کارخانے کا مالک ہے تو وہ دن رات اسی سوچ میں رہتا ہے کہ ایک سے دو اور دو سے چار کارخانوں کا مالک بننے کے لیے اسے کیا کیا طریقے اختیار کرنے ہیں —— اور اللہ اور اس کے رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حُبِّ مال اور دنیا کی محبت کو دین کا خسارہ قرار دیا ہے کہ جو شخص دنیا کمانے اور بنانے کے لیے کوشاں ہو، وہ لازماً اپنے دین کا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ اللہ کریم نے مال جمع کرنے والوں کو، ذخیرہ کرنے والوں کو سخت وعیدیں دی ہیں۔

پھر جو شخص حُبِّ مال میں یوں غرق ہو جائے کہ دن رات مال بنانے اور بڑھانے کے چکّر میں پھنسا ہو، وہ خدا اور رسولِ خدا (جل و علا و صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی خلاف ورزی یوں بھی کرتا ہے کہ وہ اپنی اس خواہش کے پیشِ نظر لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ زیادہ سے دولت کمانے کی خواہش جائز اور

ناجائز کا فرق تو ویسے بھی ذہن سے محو کر دیتی ہے۔ ایسا شخص دوسرے کاروباری لوگوں سے حسد بھی رکھتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح ضائع کر دیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے۔ مال و دولت جمع کرنے کے لیے ساعی شخص جھوٹ بولنے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسے "کاروباری ضرورت" کہتا اور سمجھتا ہے۔ ایک تو اس عمل سے وہ اللہ کی لعنت کا حق دار ہو گیا اور دوسرے جھوٹ کو برا عمل نہ کہہ کر مزید گناہ کا مرتکب ہوا۔ حرص، طمع، وعدہ خلافی اور بہت سی دوسری برائیاں اسی خواہش کی توام بہنیں ہیں کہ آدمی بہت سا مال جمع کر لے۔

یوں، ثروت و دولت اکٹھا کرنے کی تگ و دو کرنے والا ہر قسم کی برائیوں کا "الغاثہ" بن جاتا ہے۔ نیکیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اور برائیاں اسے بری طرح گھیر لیتی ہیں۔ اس طرح اس کے دل سے نیکی اور بدی کا فرق محو ہو جاتا ہے اور وہ پوری طرح قعرِ مذلت میں گر جاتا ہے۔ اسی لیے مشکوٰۃ شریف میں آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ دنیا سے محبت کرنے والا اپنی آخرت کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے اور اپنی آخرت سے پیار کرنے والا اپنی دنیا کو کبھی نہیں سنوار سکتا۔

جو آدمی اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا لے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کرنا ہے یا پھر جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کی حرص اس کے گرد گھیرا ڈال لے اور وہ اس ہوس کا اسیر ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا آدمی دین کی اصل سے ناواقف ہے یا خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی مخالفت کی جسارت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال اپنے دین کا حلیہ مکمل طور پر بگاڑ دینے کے مترادف ہے اور اس کے مقابلے میں دو بھوکے بھیڑیوں کا، کسی

روک ٹوک کے بغیر بکریوں کے گلّے کو تہس نہس کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

دولتمند بننے کی ہوس دوسرے انسانوں کے حقوق غصب کرنے پر اکساتی ہے اور دوسروں کو غریب کر کے، ان کا حق چھین کر اپنے "بینک بیلینس" کو بڑھانے اپنے کاروبار کو وسعت دینے، اپنی جائداد میں اضافہ کرنے یا اپنے کارخانوں کو پھیلانے پر راغب کرتی ہے ــــــ تو جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کا پاگل پن بھی حق کی راہ سے ہٹا دیتا ہے۔ بنیادی طور پر تو اسلام میں حُبِ جاہ اور عہدہ طلبی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بخاری شریف میں ہے، آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حکومت طلب نہ کرو۔ اگر تم نے یہ چیز مانگ کر حاصل کی تو تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ بخاری ہی کی حدیث ہے، سرکار سے کچھ لوگوں نے درخواست کی کہ ہمیں حاکم بنا دیجئے۔ آپ نے فرمایا، ہم اس آدمی کو حاکم نہیں بناتے، عہدہ نہیں دیتے جسے اس کا لالچ ہو یا وہ اس کی خواہش کرے۔

جو آدمی کوئی عہدہ چاہے، یا مرتبے کا خواہش مند ہو اور جاہ و حشم کے لیے کوشش کرے، وہ دراصل اپنی برتری کے لیے کوشاں ہوتا ہے اور اسلام نے برتری کی ایک ہی صورت رکھی ہے کہ کون شخص زیادہ پرہیزگار اور متقی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ جس شخص کے پیشِ نظر اپنی برتری ہو، اسلام میں تو اس کی سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں غرق ہونے کا تصور بھی چھوڑ دے، نیکی کی راہوں کو اپنا لے۔ مال و دولت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش سے اس طرح اپنا آپ بچا کر نکل جائے کہ اس خواہش کی جھاڑیوں کے کانٹے اس کے کپڑوں میں اٹک کر اس کی راہ بھی کھوٹی نہ کر سکیں۔

جو شخص جاہ و منصب کی خواہش کا اسیر ہو جاتا ہے، وہ ہر طریقے سے اس کے حصول کے لیے جدّ و جہد کرتا ہے اور یہ ساری کوشش اس کے دین کو نقصان

پہنچاتی ہے۔ وہ لوگوں کی تذلیل کرتا ہے، وہ لوگوں کی جان و مال و آبرو سے کھیلتا ہے۔ وہ لوگوں پر جھوٹے الزام تراشتا ہے، وہ اپنے بارے میں غلط طور پہ مشہور کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر اور برتر ہے۔ وہ اپنا جھوٹا وقار قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے دوسروں کے حقوق چھینتا ہے، خلق خدا کو تنگ کرتا ہے اور پریشان کرتا ہے، لوگوں سے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور اسی قسم کی ایسی بہت سی دوسری حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے جس سے اس کے دین کی تباہی لابدی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کے خواہشمند اس کے لیے کیا کیا کچھ کرتے ہیں۔ کتنی جھوٹی باتیں کرتے ہیں، اپنے حق میں کس قدر جھوٹا پروپیگنڈا کرتے اور کراتے ہیں، کتنی رقمیں خرچ کرتے ہیں، اسی لیے جب وہ مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتے ہیں تو لوگوں کا ہر طرح سے استحصال کرتے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں اور اپنے اعزہ اور اپنے گروہ کے لوگوں کو کس کس انداز میں ناجائز طور پر فائدے پہنچاتے ہیں۔ ظاہر ہوا کہ ایسے لوگ نام کے مسلمان ہونے کے باوجود اپنے دین کو اس سے زیادہ قبیح طریقے سے برباد کرتے ہیں جس طرح بھوکے بھیڑیے بلا خوف بکریوں کے ریوڑ کو تباہ کرتے ہیں۔

برتر پیش نظر ہو تو کمتر کو نہ بھولو

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ

(صحیح بخاری۔ کتاب الرقاق)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فخر موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا، جب کسی شخص کی نگاہ مال یا شکل کے اعتبار سے اپنے سے کسی اچھے پر پڑے تو ان لوگوں کو فوراً مد نظر کرے جو ان باتوں میں اس سے کم ہوں۔

اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ حضور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں انسانیت کی رہنمائی کی ہے، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک ارشاد پر غور کیجیے، ان کی ایک ایک ادا کو دیکھیے —— اسرار و غوامض کا سمندر موجزن ملے گا، برکات کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیں گی۔ معاشرے کے ہر مرض کا علاج اسی دار الشفاء میں ہے، معیشت کے تمام مسائل سرکار والا تبار کے ارشادات پر عمل پیرا ہونے سے حل ہوں گے، حکومت و سیاست کے بجروبر کے در بھی کلید تقلید نبوی ہی سے کھلیں گے۔ فلسفہ ہائے تعلیم اس نبی امی

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے اشارۂ ابرو سے پیدا ہوئے، اخلاق کے سوتے اس کوہسارِ خلق و مروت سے پھوٹے۔ صدق و صفا اور امانت و صداقت نے رسولِ پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے نام پایا اور آپ کی تعلیمات ہر پہلو سے انسانیت کی فلاح کی ضامن ہیں۔

آج کے معاشرے کا ہر فرد راتوں رات امیر بننے کی خواہش کا امین نظر آتا ہے۔ شرف و مجدِ انسانیت کی توہین یوں ہو رہی ہے کہ بڑائی کا معیار دولت بن کر رہ گئی ہے۔ جس کے پاس پیسہ ہے، وہ اگر اخلاق لحاظ سے گرا ہوا بھی ہے، تعلیمی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں بھی رکھتا، ذہنی کیفیت کے حوالے سے پست بھی ہے تو قابلِ تکریم ہے، لائقِ عزت و احتشام ہے۔ فکر کی اس کجی نے دولت کے حصول میں مسابقت اور حسد کی کیفیتیں جنم دی ہیں اور معاشرہ ایک سے ایک جرم کی آماجگاہ بنا دکھائی دینے لگا ہے۔ جس کے پاس ایک کار ہے، وہ دو کاروں والے سے جلتا ہے، جس کو دو کوٹھیاں میسر ہیں، وہ چار کارخانوں والے کی طرف دیکھتا ہے ——— اور جس کے پاس بہت کم ہے، وہ ان سب کا مخالف ہے۔ ہر آدمی کی نگاہ اپنے سے "بڑے" کی طرف اُٹھتی ہے اور رشک سے نہیں، حسد سے اُٹھتی ہے۔ وہ یہ ہے، میں یہ کیوں نہ بنوں، فلاں کے پاس جو کچھ ہے، میں وہ کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ اس طرح سے کاروبار میں "بے ایمانیاں" ہوتی ہیں، اشیائے صرف میں ملاوٹ کا تناسب بڑھتا جاتا ہے، انکم ٹیکس کی چوری کے سائنٹفک طریقے ایجاد ہو رہے ہیں رشوت کا "کاروبار" ترقی پر ہے، دیانت عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ ہر شخص پیسہ کمانے اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی سوچ میں مستغرق ہے ——— اور اس سوچ کی کوئی انتہا نہیں۔ کیونکہ اگر اس طرح اٹھارہ کاریں، پچیس کوٹھیاں،

درجنوں کارخانے بھی بنا لے، کروڑوں کا بینک بیلنس بھی اکٹھا کر لے تو اس سے آگے کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے۔ اس ملک میں نہ ہو گا تو کسی اور ملک میں ہو گا۔ ——— اور، حرص بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

محسنِ انسانیت حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان لامحدود خواہشات کی پیدائش ہی روک دی۔ فرمایا، جو شخص مال کے اعتبار سے اپنے سے بہتر کو دیکھے، فوراً اپنے سے کمتر پر نظر ڈال لے۔ اگر اُسے یہ معلوم ہو گا کہ اُس سے زیادہ پیسے والا اُس سے زیادہ وسائل کا حامل موجود ہے تو اسے یہ بھی احساس ہو جائے گا کہ اُس سے کم حیثیت آدمی بھی تو دنیا میں موجود ہیں۔ اس طرح اُس میں صبر و قناعت کی صفت پیدا ہو گی اور معاشرے میں جنم لینے والی بیسیوں خرابیوں کی بیخ کنی ہو جائے گی۔

پھر کمتر کو پیشِ نظر رکھنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر ضروری ہو تو اس کی مدد کرو۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے اگر آپ کے پاس ضرورت سے زیادہ ہے تو اُسے دے دو۔ کیونکہ اسلام کا نظام کفالت یہاں بھی ترغیب دیتا ہے۔ اور، اگر یہ زیادہ رکھنے والا اپنے سے کمتر کا اسی طرح خیال رکھے تو معاشرے کا ہر فرد خوشحال ہو جائے اور طبقات جنم ہی نہ لے سکیں۔

مال کے علاوہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی بہتر آدمی کو دیکھنے والا شخص احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے، کبھی خالقِ حقیقی کا شکوہ کرنے لگتا ہے اور اپنی دنیا و عاقبت بگاڑ بیٹھتا ہے۔ عورتوں میں یہ احساسِ کمتری عجیب عجیب برگ و بار لاتا ہے اور معاشرے میں طرح طرح کے جرائم پیدا ہونے لگتے ہیں۔ حسد کی جلن سے گھر، محلے اور قبیلے برباد ہو جاتے ہیں اور ماحول کی فضا تکدر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی بیوی اپنے خاوند سے اور شوہر اپنی اہلیہ سے زیادہ

خوش شکل اور خوبصورت آدمی کو دیکھ کر احساسِ محرومی کا شکار ہو جائے تو معاشرے میں فحاشی جنم لیتی ہے، گرد و پیش کا تقدس مجروح ہو جاتا ہے، معاشرے کا سکون غارت ہو جاتا ہے —— اور اگر یہ احساس عام ہو جائے کہ حُسنِ صورت میں مجھ سے یا میرے متعلقین سے اگر کچھ لوگ بہتر ہیں تو کچھ کمتر بھی ہیں —— تو انسان شکر گزاری کے احساس سے مملو ہو جاتا ہے، اور رقابت کی آگ میں نہیں نہیں جلتا اور احساسات کے تالاب کی سطح میں ہلچل پیدا نہیں ہوتی، جذبات کے تنکوں میں آگ نہیں لگتی اور ماحول اور معاشرے کے امن و سکون کی بربادی کا اہتمام نہیں ہوتا۔

سرکارِ دو عالم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات پر اور ان کی رسالت و خاتمیت پر اگر ہمارا ایمان مضبوط و مستحکم ہے، اگر ان کا فرمان حکمِ خدا کی سی اہمیت رکھتا ہے اور ان کے حکم سے سرتابی ایمان کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے تو ہمیں دولت یا حُسن کے حوالے سے، اپنے سے بہتر آدمی کو دیکھتے ہی اپنے سے کمتر اشخاص کا خیال کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں اپنا فرض بھی نبھائیں گے اور دین و دنیا میں سرخروئی کی نوید بھی پالیں گے۔

خوشحال معاشرے کی بنیاد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ كَنْزُ اَحَدِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ يَفِرُّ مِنْهُ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يَطْلُبُهٗ حَتّٰى يُلْقِمَهٗ اَصَابِعَهٗ

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا خزانہ قیامت کے دن ایک گنجا سانپ بن جائے گا۔ اس کا مالک اس سے بھاگے گا اور وہ اسے ڈھونڈتا پھرے گا، یہاں تک کہ اسے پالے گا اور اس کی انگلیوں کو لقمہ بنائے گا۔

دراصل اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کی ملکیت اللہ کی عطا سے ہے۔ اس لیے دولت پر انسان کا تصرف احکامِ خداوندی کے تابع ہونا چاہیے۔

اسلام کمائی کے ذرائع میں جائز و ناجائز کی حد و تعیین کرتا ہے اور سختی سے ان حدود کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر ناجائز طریقوں پر خرچ کی روک تھام کرتا ہے۔ عیاشی، قماربازی، شراب نوشی، بے جا اسراف اور قومی دولت کے ضیاع کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے۔ لیکن احتکار یعنی hoarding کی مخالفت کرتا ہے، بخل کو بہت

بُرا گردانتا ہے: زکوٰۃ، عُشر، مالی کفاروں اور صدقات کے ذریعے گردشِ زر کا اہتمام کرتا ہے اور تقسیمِ دولت کے اس نہایت مؤثر نظام کی بدولت معاشی توازن کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر نماز کے ساتھ کیا ہے اور ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر اسے فرض قرار دیا ہے۔

خداوندِ کریم و عظیم نے فرمایا وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى سرکار کی بات خدا ہی کی بات ہوتی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مال عطا کیا اور وہ اس میں بخل برتتے ہیں، اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ یہ بُرا ہے اور قیامت کے دن وہی مال ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا)۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے اس آیت کے حوالے سے فرمایا فَاِنَّ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكٰوتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ ذَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِيْ شِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ فرمایا جس شخص کو خدا تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کے مال کا ایک گنجا سانپ بنایا جائے گا جس کی آنکھوں میں دو سیاہ شعلے ہوں گے اور سانپ کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ پھر یہ سانپ اس شخص کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا، میں تیرا مال ہوں اور تیرا خزانہ ہوں۔

ترمذی اور ابنِ ماجہ میں حضرت ابنِ مسعود نے بھی اسی قسم کی حدیث روایت

کی ہے۔

قرآن پاک کی آیت اور احادیث پاک میں اس مال کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ اس میں اس تصور ہی کی تغلیط کر دی گئی ہے کہ مال حرام ذرائع سے کمایا گیا ہو۔ اسلام فرد کو معاشی جد و جہد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اس کی نجی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ کمائی کے ذرائع کے جائز اور حلال ہونے پر زور دیتا ہے اور حصولِ معاش کی آزادانہ سعی میں حلال و حرام کی حدیں متعین کرتا ہے۔ حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کا وہ جائز مالک نہیں ہے۔ اسلام میں ناجائز کمائی کا تصور ہی نہیں ہے اور اگر کوئی شخص کسی طرح سے ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کر ہی لے تو اسلامی ریاست کو اختیار ہے کہ وہ اس کا محاسبہ کرے جیسا کہ مثلاً حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا۔ جائز کمائی پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔

سننِ ابوداؤد میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، ان اللّٰہ لم یفرض الزکوٰۃ الا لیطیب ما بقی من اموالکم یعنی خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔

لیکن جو شخص عطائے خداوندی سے مال پا لے مگر زکوٰۃ ادا نہ کرے، اس کے لیے سخت وعیدیں ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے، ان کو روزِ قیامت کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں جس دن ان کے جمع کیے ہوئے کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان کے ماتھے اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا، یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ آج اپنے جمع کیے کا مزہ چکھو ـــــــ سورۃ التکاثر کا آغاز اس سے ہوا ہے" تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے۔ قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو۔ جلد ہی تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔"

یعنی جو شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی برتتا ہے، اکتنازِ زر کا مرتکب ہوتا ہے، قیامت کے دن اس کا مال اس کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ یہ مال خوفناک سانپ بن کر اُس کی باچھوں کو گرفت میں لے کر اسے بتائے گا کہ وہ کیا ہے۔ اس مال کو دوزخ کی آگ میں تپا کر اس کا ماتھا، پہلو، اس کی پیٹھ اس سے داغے جائیں گے۔

اسلام کا گردشِ دولت اور تقسیمِ زر کا یہ نظام اس حقیقت پر منتج ہوتا ہے کہ اگر زکوٰۃ، عشر، مالی کفاروں، صدقات اور سخاوت کی مختلف صورتوں کے بعد بھی کسی شخص کے پاس اس کی حلال کمائی میں سے کچھ دولت بچ جاتی ہے تو وہ قانونِ وراثت کے تحت تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسلامی اقتصادیات کی اساس ہی تقسیمِ دولت اور گردشِ زر پر ہے اور شرعِ مبین کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور ایک خوشحال معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین این ست و بس

غیبت کی ممانعت اور اس کی ہمہ گیری

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِيْ أَخِيْ قَالَ إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَإِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ و رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا، غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے متعلق ایسی بات کہے جو اسے بری لگے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ برائی موجود ہو جس کا ذکر کیا جائے تو کیا یہ بھی غیبت کہلائے گی؟ فرمایا کہ جو برائی اس میں موجود ہے، اسی کا ذکر تو غیبت ہے۔ اگر ایسی بات کہو جو اس میں موجود نہ ہو تو یہ بہتان ہے۔ (مسلم شریف)

سورۃ الحجرات میں خداوند ذوالجلال جل شانہٗ نے فرمایا:

ولا یغتب بعضکم بعضا۔ ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ

(اور کوئی تم میں سے کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟)

اللہ تعالیٰ نے غیبت سے مسلمانوں کو منع فرمایا اور اس فعل کو مردہ بھائی کا

گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا۔ سرورِ ہر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے متمتّع ہونے والے اس حکم کی سختی سے تو آگاہ ہو گئے اور سمجھ لیا کہ یہ کام نہیں کرنا ہے لیکن معلمِ کائناتِ عالم ماکان و مایکون صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ بعض اذہان غیبت کے معنی کے بارے میں صاف نہیں ہیں، سب لوگوں پر واضح کرنے کے لئے اپنے نام لیواؤں سے سوال کیا کہ غیبت کے بارے میں جانتے ہو کہ یہ کیا ہے ؟۔ ایسے کسی بھی سوال کے جواب میں صحابۂ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) ہمیشہ "اللہ و رسولہٗ اعلم" کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور اس کی عطا سے اس کے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کائناتِ عالم کی ہر شے کا علم رکھتے ہیں۔

جب آقا حضورؐ کے عشاق نے اس حقیقت کا اعلان فرما دیا تو حضور نے اس فعل کی وضاحت فرما دی اور مسلم شریف کی محولہ بالا حدیث کے مطابق سرکار نے بتا دیا کہ کسی شخص میں پائی جانے والی کسی خرابی کا ذکر غیبت ہے اور اگر کسی ایسی برائی کا ذکر کیا جائے جو شخص مذکور میں نہ پائی جاتی ہو تو یہ بہتان ہے۔

اب، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم اُمتیوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شب و روز کا احتساب کریں کہ ہم دن بھر میں اپنے مردہ بھائیوں کا گوشت کھانے کا یہ عمل کتنی بار کرتے ہیں اور جس کام سے ہمیں خدا اور رسول نے منع کیا ہے کبھی اس کے بارے میں سوچنے کا تکلف بھی کرتے ہیں یا نہیں ؟ ہمارے معاشرے کا ایک ایک فرد (الا ماشاء اللہ) دن بھر میں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ بظاہر نیک لگتے ہیں، ان میں سے بھی کتنے ہیں، جن کی زبانیں اس ناسور سے محفوظ ہیں ؟

اگر ہم، اپنے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والے، ان سے محبت کا دم بھرنے والے، ـــــ بلکہ ہم میں سے وہ بھی جو بظاہر سرکارؐ کے احکام پر عمل پیرا نظر آتے ہیں، دن میں پانچ سے زیادہ مرتبہ خداوند تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں سر بھی

جھکاتے دکھائی دیتے ہیں، رمضان اور اس کے علاوہ بھی روزہ دار نظر آتے ہیں، ـــــ بلکہ "خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں" کے مصداق بنتے ہیں اپنے کسی مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی ذات میں پائی جانے والی کسی خرابی کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہم کہاں سے نیک ہیں، ہم کس سطح کے مسلمان ہیں اور کیا خداوند قدوس کے اس صریح حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے کہ "تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے" اور ہمیں کراہت کی انتہا کے پیشِ نظر اس حکم کو اس طرح بھی سمجھایا گیا کہ ایسا کرنا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے ـــــ اور آقا حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ غیبت کیا ہے اور بہتان کیا۔

اب ہم عبادات کے معاملے میں جس بے حسی کو مجموعی طور پہ شعار کیے ہوئے ہیں، وہ ظاہر ہے۔ لیکن جو شریف آدمی عبادات کے معاملے میں کچھ پابندی کرتے نظر آتے ہیں، ان میں سے بھی زیادہ تر لوگ ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے جن پہ قرآن و احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے کہ مساجد میں گروہ بندیاں اور پارٹی بازیاں ہوتی ہیں۔ دن بھر دوسرے گروہ یا مسلک یا پارٹی کے لوگوں کے خلاف باتیں ہوتی ہیں۔ فلاں نے کل یہ کہا، فلاں نے پرسوں یہ حرکت کی، فلاں ہمارے خلاف یا ہمارے مسلک یا گروہ کے خلاف یہ کچھ کہتا رہتا ہے۔ یہ ساری باتیں اب روزمرہ کا درجہ اختیار کر گئی ہیں اور مسجد کے مولوی صاحب سے لے کر عام مقتدیوں تک اس گناہ میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ پھر وہاں دوسرے بھائیوں کی عدم موجودگی میں کی جانے والی ان باتوں میں سے کچھ درست ہوتی ہیں، کچھ غلط۔ یعنی کچھ لوگ غیبت کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں اور کچھ بہتان تراشی

میں مشغول ہوتے ہیں۔

جب مساجد تک میں یہ جرم یوں در آیا ہے کہ جرم سمجھ کر نہیں، نیکی جان کر کیا جاتا ہے تو بازاروں، گلی کوچوں، دفتروں، کاروباری اداروں اور گھروں کا کیا حال ہوگا، جسے خداوند عالم جل وعلا توفیق مرحمت فرمائے، وہ تو ظاہر ہے کہ اس گناہ یا ہر گناہ سے بچ سکتا ہے لیکن موجودہ معاشرے کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ غیبت کے جرم سے تو بظاہر کوئی شخص محفوظ نظر نہیں آتا۔ اُس معاشرے کا کیا حال ہوگا جس کا تقریباً ہر فرد اپنے مردہ بھائی کا گوشت ادھیڑنے میں مصروف ہو۔

اصل میں، خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم) کا ہر حکم اپنے اندر سیکڑوں ہزاروں حکمتیں رکھتا ہے لیکن ہر ارشاد دوسرے احکام و ارشادات کے ساتھ مربوط بھی ہے۔ بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ محبت و مودّت کے جو احکام قرآن و احادیث میں موجود ہیں، ان کے ساتھ مردہ بھائی کے گوشت کھانے کی تشبیہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر، آج کل کا معاشرہ چوں کہ بھائیوں کے ساتھ محبت کے معاملے میں بھی بس ایسا ہی ہے، خون سفید ہو رہے ہیں، محبتیں اُٹھتی جا رہی ہیں، بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے اور یہ احکام خدا و رسولؐ سے صرفِ نظر کے باعث ہو رہا ہے۔ اس لیے شاید صرف زیر نظر حدیث کا زیادہ اثر ہم پر نہ ہو کہ مجھے بھائی کے ساتھ محبت ہی کتنی ہے، اگر غیبت کرنا مردہ بھائی کا گوشت کھانا بھی ہے تو شاید میری بیگم ہی اس سے خوش ہو جائے: اچھا ہے، یہ گوشت کھاتے رہنا چاہیے۔ اور پھر میں ویسے کون سا حلال ہی کھاتا رہتا ہوں۔

یاد رہنا چاہیے کہ یہ محبتوں سے محروم کسی شخص کا اُس کے مردہ بھائی کا گوشت کھانے ہی کا معاملہ نہیں ہے، خدا اور رسولؐ کے احکام کی صریح خلاف ورزی کا بھی مسئلہ ہے۔ اور یہ مسئلہ بہت اہم ہے، بہت ہی اہم!!

تکبر، بدخلقی اور اکھڑپن

عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعَّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ

(صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم)

حارثہ بن وہب خزاعی کہتے ہیں، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اہلِ بہشت کی علامت نہ بتاؤں ؟ جنتی وہ لوگ ہیں جو کمزور اور بے حیثیت نظر آتے ہیں۔ اگر وہ لوگ اللہ کے بھروسے پر کوئی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم سچی کر دیتا ہے۔ اور میں تمہیں دوزخیوں کی خبر بھی دے دوں۔ ہر اکھڑ، بدخلق اور متکبر شخص دوزخی ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی علامتیں بیان فرما دی ہیں۔ ایسے لوگ جو بظاہر کمزور اور بے حیثیت نظر آتے ہوں، معاملات میں اکھڑ اور سخت نہ ہوں، بدخلق اور مغرور نہ ہوں بلکہ اس کے برعکس ان کا رویہ عاجزوں اور کمزوروں کا سا ہو، اس لیے لوگ انہیں "ضعیف"

سمجھتے ہوں، —— وہ لوگ جنتی ہیں اور جو لوگ ان کے خلاف عادات رکھتے ہوں، اکھڑ ہوں، بدخو اور بدخلق ہوں، مغرور اور متکبر ہوں، دوزخ کے باسی ہیں۔

حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اہلِ جنت کو "ضعیف" فرمایا ہے۔ اس سے مراد وہ کمزوری اور ضعف نہیں ہے جو طاقت کے مقابلے میں ہوتی ہے بلکہ حدیثِ پاک ہی کے آخری حصے میں صراحت موجود ہے کہ یہ ضعف اصل میں تکبر، بدخلقی اور اکھڑپن کی ضد ہے۔ جو اکھڑ ہے، اس میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہے اور وہ "ہمچو ما دیگرے نیست" کے زعم میں مبتلا ہے، وہ جہنمی ہے اور جو اس کے برعکس صفات رکھتا ہے، وہ ضعیف ہے، متضعف ہے اور جنتی ہے۔

معلوم ہوا کہ جنت کے حقدار وہ ہیں جو متواضع، نرم خو اور شریف الطبع ہوں۔ ایسے لوگ مغرور، بدخو اور اکھڑ نہیں ہوتے۔ وہ برتاؤ میں عاجزوں اور کمزوروں کی طرح محسوس ہوتے ہیں، غرور و استکبار اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ یہ بظاہر عاجز اور بے حیثیت لوگ اگر اللہ کے بھروسے پہ کوئی قسم کھا لیں تو اللہ ان کی قسم کو سچا کر دیتا ہے۔ یعنی یہ جنتی آدمی کوئی بات وثوق اور یقین کے ساتھ، اللہ کے بھروسے پر کریں تو وہ بات پوری ہو سکتی ہے۔ اللہ کریم کو ان کی یہ عاجزی اور کمزوری کا یہ اظہار اتنا بھاتا ہے کہ اگر وہ اس پہ پورے یقین کے ساتھ کوئی قسم کھا لیں تو سرکار فرماتے ہیں کہ اللہ اس قسم کو سچا کر دکھاتا ہے۔ اس کے برخلاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص میں تکبر کو پسند نہیں فرماتا اور ایسے لوگ جن کے

دوزخی ہونے میں شبہ نہ ہو، خدا کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ بیہقی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شافع روز جزا علیہ التحیۃ والثنا نے ایک دن خطبے میں فروتنی اور خاکساری اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی اور فرمایا کہ جو شخص اس راہ پر چلا اللہ تعالیٰ اُسے بلند کردے گا اور جو کوئی تکبر کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نیچا گرا دے گا۔ یعنی فروتنی اور عاجزی اختیار کرنے والا شخص لوگوں کی نظروں میں بھی اونچا ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی اعلیٰ مقام پا لے گا اور استکبار کی راہ کا راہی عام لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا ہو جائے گا، لوگ بھی اسے حقیر جاننے لگیں گے اور بارگاہِ ایزدی میں بھی وہ بے حیثیت ہو جائے گا۔ شعب الایمان کی اس حدیث مبارکہ کے آخر میں ارشاد ہے کہ تکبر کو اختیار کرنے والا اگرچہ اپنے خیال میں بڑا ہوگا لیکن دوسروں کی نظروں میں وہ کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل، بے وقعت اور حقیر و بے حیثیت ہو جائے گا۔

دراصل خداوندِ کریم چاہتا ہے کہ اس کی تمام صفات اس کے بندوں میں پائی جائیں مگر اس کی صفتِ تکبر اس کے لیے خاص ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ انسان اس صفت سے متصف ہو جائے۔ یہ صفت تو خالق و مالکِ حقیقی ہی کو زیبا ہے وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (جاثیہ) اور آسمانوں اور زمینوں میں اُسی کے لیے کبریائی اور بڑائی ہے اور وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔

اسلام ایک پُرسکون معاشرے کی تعمیر کرتا ہے جہاں ہر آدمی دوسرے کا

بھائی ہے، اس کا دوست ہے، اس کے بُرے بھلے کا ساجھی ہے۔ جہاں کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی جان و مال و آبرو کا دشمن نہیں۔ جہاں ہمسائے کو ہمسائے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر کسی کا پڑوسی رات کو بغیر کھائے پیئے بھوکا سو گیا تو وہ شخص جنت میں جانے کا حقدار نہ رہا۔ جہاں کسی دوسرے کو تکلیف پہنچانے یا آزار دینے کا تصور نہیں ہے۔ ایسے معاشرے میں اگر کوئی شخص بدخلق اور بدخو ہو، لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش نہ آئے، اس کی عادتیں پسندیدہ نہ ہوں، وہ شخص نرم خو اور خوش خلق نہ ہو، خوش مزاج نہ ہو، سلیم الطبع نہ ہو — لوگوں کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آئے، اکھڑ ہو، اپنے دل میں غرور و تکبر کی تخم ریزی کرتا ہو، اپنے سوا کسی کو نہ گردانے، اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھے، استکبار کا جرم کرتا ہو — تو ظاہر ہے کہ وہ ایک پُرسکون معاشرے کے امن کو برباد کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ محبتوں کی فضا میں نفرتوں کی گرد اُڑاتا ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کے لیے اپنے دل میں نیک جذبات نہیں رکھتا، اپنے رویّوں سے انہیں آزار دیتا ہے۔ لوگ ایسے آدمی کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھ سکتے۔ اس طرح معاشرے میں نفرتیں جنم لیتی ہیں، محبتوں کی بیخ کنی ہونے لگتی ہے، دوریاں بڑھتی ہیں، فاصلے زیادہ ہوتے ہیں، قربتیں گھٹنے لگتی ہیں اور بیگانگیاں جڑ پکڑتی ہیں۔ یہ اسلام کے قائم کردہ پُرسکون اور پُرامن معاشرے کو تباہ و برباد کر دینے کی سعی ہوتی ہے۔ پھر اس کا مرتکب دوزخ کا ایندھن کیوں نہ بنے۔

جو لوگ مغرور، بدخلق اور اکھڑ نہیں ہوتے، وہ متواضع ہوتے ہیں، خوش اخلاق ہوتے ہیں، شریف النفس اور سلیم الطبع ہوتے ہیں۔ انہیں لوگ

کمزور سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ وہ دنیا کی نظر میں عاجز، اور بے حیثیت ہوتے ہیں، بُرے لوگ انہیں "ضعیف" اور "مستضعف" سمجھ کر دبا لیتے ہیں لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی یہ تواضع، یہ نرمی، یہ عاجزی و فروتنی مقبول ہے کہ وہ اگر اُس کے بھروسے پر کوئی قسم بھی کھالیں تو آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم سچی کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ اہلِ جنت ہیں۔
ایسے لوگوں کے رویّوں سے معاشرے میں سکون و عافیت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ان کی یہ نیکیاں دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ایسے اخلاق کو اپنا لیتے ہیں جنہیں خدا اور رسولؐ پسند فرماتے ہیں پھر معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبانِ اتقا ہوتے ہیں۔

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

عن ابی هریرة قال قال النبی صلی الله علیه وسلم تجد من شر الناس یوم القیامة عند الله ذا الوجهین الذی یاتی هؤلاء بوجه وهؤلاء بوجه

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے روبرو تم اسے سب سے بدتر پاؤ گے جو دو چہرے رکھتا ہو۔ ایک جگہ ایک چہرہ لے کر جاتا ہے اور دوسری جگہ دوسرا چہرہ۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الادب)

فخرِ موجودات سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے اسلام کی صورت میں ہمیں جو راہ صواب دکھائی ہے اس میں نیکی کی تلقین کی ہے، برائیوں سے بچنا سکھایا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی گنجائش نہیں ہوتی، کہ آپ گھر میں تو نیک ہوں، بازار میں کچھ اور ہو جائیں۔ بزرگوں میں شرافتوں کے پاسدار نظر آئیں، بے تکلفوں میں رذالت کا مظاہرہ کریں۔ مسجد و منبر پر حسنات کا مرقع و منبع دکھائی دیں، خلوت میں کارِ دیگر کے مرتکب ہوں۔ اسلام ہمیں منافقتوں سے نفرت کا درس دیتا ہے، اتحادِ فکر و عمل سکھاتا ہے، انسان کے دو رُخے ہونے کے تصور کی تغلیط کرتا ہے۔

خداوند قدوس و کریم نے ہر انسان کو ایک چہرہ عطا کیا ہے اور اسے بتایا ہے کہ وہ کس طرح اسے داغ دھبوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ چہرے کی صفائی کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ اسے حالاتِ زمانہ کی گرد معصیتوں کی کالک اور منافقتوں کے دھبوں سے بچائیں۔ چہرہ خدا تعالیٰ کی وہ نعمت ہے کہ اسے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے لوگوں سے چھپاتے پھرنا یا اس پر مختلف قسم کے خوبصورت نقاب اوڑھنا کسی طرح درست نہیں۔ کسی محفل میں اس کو کسی اور انداز میں پیش کرنا اور کسی دوسری جگہ اسے دوسری صورت میں سامنے لانا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ آپ نے اپنے چہرے کا اصلی روپ مسخ کر دیا ہے اور اسے اس کی حقیقی صورت میں لوگوں کے سامنے لانے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کی اس عظیم نعمت کو کسی نقاب، کسی اوٹ کی ضرورت نہیں۔

محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء نے فرمایا ہے کہ جو شخص ایک جگہ پر مختلف اور دوسرے مقام پر اس سے مختلف چہرہ لے کر جاتا ہے اور اپنی اصلیت چھپاتا ہے وہ اتنا بڑا مجرم ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے بدترین صورت اسی کی ہوگی۔ یعنی سرکارِ دو عالم تاجدار نے اس جرم کو سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ عملی دنیا میں ہم میں سے کون کون اپنے چہرے پر خول چڑھانے کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اور اگر ہم اپنے آپ کو مجرم محسوس کریں تو کیا ہمیں احساس ہے کہ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قیامت کے دن اپنے برگ و بار لائے بغیر نہیں رہے گا اور ہم میں سے اس جرم کا ہر مرتکب مجرمین کی صفِ اوّل میں جگہ پائے گا۔ اور پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟

اپنی معاشرتی زندگی میں ہم میں سے کتنے ہیں جو زید کو ہنس کر ملتے ہیں، اس کے یا اس کے دوستوں ہمنواؤں کے سامنے اس کی تعریف کرتے ہیں اور پھر اس کے دشمنوں یا اس سے غیر متعلق لوگوں کے سامنے اس کے خلاف گفتگو کرتے ہیں۔ اندازہ فرمائیے کہ آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کیا ہم اس طرح اپنے اصلی چہروں پر دوسرے

چہرے نہیں سجا لیتے۔ اور حقیقت میں منافقت سے لے کر غیبت تک کے ہر جرم کا ارتکاب نہیں کرتے ـــــ اور منافقت اور غیبت کے بارے میں خداوندِ قہار و جبار نے جو وعیدیں فرمائی ہیں، اُن کی طرف سے آنکھیں مُوند لینے سے کیا ہم اپنے اعمال کی مکافات سے بچ سکیں گے؟

ایک جگہ ایک چہرے اور دوسری جگہ دوسرے چہرے کی نمائش کرنے والا انسان ریاکاری کے درجۂ اسفل میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ریاکار کی کوئی عبادت قبول ہونے کا کیا سوال۔ خدا اور رسول (جل وعلیٰ وصلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ دھوکا کرنے کی اس حرکت کا عبرت ناک انجام دنیا و آخرت میں اس کا منتظر ہوتا ہے۔

جو شخص کسی ایک محفل میں یا کسی ایک فرد کے سامنے مختلف بات کرتا ہے اور کسی دوسری بزم میں یا کسی دوسرے انسان کے سامنے اور بات کرتا ہے، گویا وہ ایک جگہ ایک چہرہ لے کر جاتا ہے اور دوسرے مقام پر اپنے دوسرے چہرے کی نمائش کرتا ہے۔ وہ اپنی اس حرکت کے نتیجے میں اور بہت سے جرائم کے ساتھ جھوٹ بولنے کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سچ یا جھوٹ تو ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان میں لچک نہیں ہے۔ سچ یہاں بھی سچ ہے اور وہاں بھی۔ جھوٹ ہر جگہ جھوٹ ہی ہے۔ اپنے چہرے پر مختلف مقامات پر مختلف خول استعمال کرنے والا شخص حقیقت میں بہت بڑا کاذب اور دروغ گو ہوتا ہے اور خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو جھوٹ بولنے سے اجتناب کی ہی ہدایت نہیں کی، ان جھوٹوں کو اپنی لعنت کا مصداق بھی ٹھہرایا ہے۔ پھر ایسا شخص قیامت کے روز رُوسیاہوں میں سرکردہ کیوں نہ ہوگا۔

مختلف جگہوں پر مختلف چہروں کا مظاہرہ کرنے والا شخص، اچھوں میں اچھا اور بُروں میں بُرا بنتا ہے اور یہی منافقت ہے۔ منافق لوگ مسلمانوں میں اپنا چہرہ الگ رکھتے تھے اور کافروں میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ جاتے تھے۔ دینِ متین نے منافقین کا

درجہ کافروں کے مقابلے میں "بڑا" کہا ہے۔ یہ کافروں سے بدتر مخلوق ہے۔ منافقت کو شعار کرنے والا ہر آدمی اس عمل کے انجام و عواقب کو پیش نظر رکھے اور نبی نذیر حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے عبرت سیکھے وہ بروز یوم النشور کو اس سے بدتر کوئی مخلوق نہ ہوگی۔ عامۃ الناس کو بھی چاہیے کہ منافقت مآب لوگوں سے دور رہیں' ان کے چہروں پر پڑے ہوئے خولوں سے مرعوب و متاثر نہ ہوں اور ان کے اندر جھانک کر اپنے آقا، کائنات کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو پڑھ لیں کہ قیامت کے دن ایسے لوگ بدترین شمار ہوں گے۔ ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں ہم دلفریب نقابوں سے متاثر ہو کر پیتل کے چہروں کو پاسے کا سونا نہ سمجھ بیٹھیں۔

لوگ اکثر اپنے چہروں پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے، کہیں پیتل نہ ہو

حضور خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک چہرے پر مختلف چہرے سجانے کو سب سے بڑا جرم فرمایا ہے مختلف جگہوں پر اپنے مختلف رخوں کا مظاہرہ کرنے کی ایک صورت ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی ادھر لگانا ہے۔ لگائی بجھائی کا یہ عمل فتنہ و فساد کے کتنے در کھولتا ہے، اس سے کتنے دلوں میں تکدر رنجیاں پیدا ہوتی ہیں' کتنے اشخاص میں دوریاں جنم لیتی ہیں۔ کتنے قبیلوں اور گروہوں میں دشمنیاں پنپتی ہیں اور کتنی روحیں زخمی ہوتی ہیں' ـــــ کس طرح ماحول پر تکدر سایہ کناں ہو جاتا ہے اور معاشرے سے سکون رخصت ہو جاتا ہے' ـــــ اس پوری صورت حال کے تناظر میں آپ اندازہ فرمائیے کہ غیب کی خبریں بتانے والے نے اس مفسد آدمی کی فتنہ انگیزیوں کو بدلتے ہوئے چہروں کی تشبیہ کے ساتھ واضح فرمایا ہے اور ہمیں ایسے اشخاص سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ایسے لوگ اپنے دو رخے پن کے پتھروں سے امن و سکون کے تالاب میں لہریں پیدا کر دیتے ہیں اور معاشرے کا سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے۔ ماحول مکدر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، پھر چہروں کا

یہ دو رخا پن بہت بڑا جرم کیوں نہ ہو۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم مسلمان بھی ہیں' خداوند تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت کے قائل بھی ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے دعوے دار بھی ہیں لیکن خدا اور رسولؐ کے احکام سے روگردانی کو اپنے اعمال کی بنیاد بھی بنائے بیٹھے ہیں۔ آقا حضورؐ نے ہمیں زندگی گزارنے کے جو اصول بتائے ہیں' ہم ان سے نفور ہیں۔ ہماری بہتری کے لئے جو طریقے انہوں نے ہمیں سکھائے ہیں' ہم انہیں بھول جانے کی روش پر گامزن ہیں۔ اگر ہم ایک چہرے پر کئی چہرے سجانے اور مختلف جگہوں کے لئے اپنے چہرے کے مختلف انداز سامنے لانے کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا آقا حضورؐ سے محبت کا ہمارا دعویٰ درست ہے؟

یہ "ایمان" کی عجیب و غریب صورت ہوگی کہ ہم زبانی اقرار کریں اور عملاً انکار۔ تسلیم کریں کہ جو کچھ ہمارے آقا کی زبان حق ترجمان سے نکلا ہے وہ درست ہے لیکن اس پر عمل در آمد مشکل۔ وما ینطق عن الھویٰ۔ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ سرکار کی ہر بات وحی خدا ہے لیکن ہم اپنے چہروں کی اصلیت کو ضرور چھپاتے ہیں ـــ ریاکاری کو نہیں چھوڑتے، ہم منافقت سے نفرت نہیں کرتے، فساد و فتنہ کو پھیلانے کا گناہ ضرور کرتے ہیں، جھوٹ سے مجتنب نہیں ہیں، مردہ بھائی کا گوشت کھانے میں کراہت محسوس نہیں کرتے ـــــ یعنی اس جگہ اور، اور دوسری جگہ دوسرا چہرہ دکھاتے ہیں۔

کیا ہمیں ذرا بھی ڈر نہیں کہ قیامت کے دن بدترین مخلوق ہم ہوں گے؟

منافق کی چار خصلتیں

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَّمَنْ كَانَ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (بخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس میں جمع ہو جائیں، وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان سے کوئی ایک ہو، اس میں نفاق کی ایک عادت ہے۔ اور جب تک اس عادت کو چھوڑ نہ دے، وہ اسی حال میں رہے گا ——— وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے، باتیں کریں تو جھوٹ بولے، عہد کرے تو خلاف ورزی کر ڈالے اور کسی سے جھگڑا ہو تو بدزبانی کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا کہ یہ لازماً دوزخ کے سب

سے نچلے طبقے میں ڈالے جائیں گے۔ منافق اسے کہتے ہیں جو بظاہر تو خدا اور رسولِ خدا جل شانہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، احکامِ اسلام کو مانتا دکھائی دے۔ لیکن دل سے اس نے ایمان قبول نہ کیا ہو۔ اپنے آپ کو مومن ظاہر کرے مگر اندر سے اسلام اور اسلامیوں کا مخالف ہو اور اس قسم کی حرکتوں کا مرتکب ہو جس سے دینِ متین اور اس کے ماننے والوں کو نقصان پہنچے۔ وہ دین کو نقصان پہنچانے کے لیے بظاہر ایمان لے آیا ہو۔ جو لوگ ظاہراً اسلام کے مخالف ہوں، ان کا تو سب کو علم ہوتا ہے لیکن ایسے "نقاب پوش کافروں" سے دین کو زیادہ خطرہ ہوتا ہے جو اسلام کی فصیل کے اندر رہتے ہوئے اسے ضرر پہنچانے کے لیے ساعی ہوں۔ اس لیے انہیں کافروں سے زیادہ قابلِ نفرین قرار دیا گیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محولہ بالا حدیث پاک میں "خالص منافق" کی چار عادتیں بیان فرمائی ہیں جن سے منافق پہچانا جا سکتا ہے۔ یعنی ان چار خصلتوں کا حامل وہ شخص ہوگا جو بظاہر مسلمان نظر آئے گا، وہ دعویٰ بھی کرے گا کہ صاحبِ ایمان ہے۔ ہو سکتا ہے، نماز روزے اور دوسری عبادات بھی عام لوگوں سے زیادہ ہی کرتا ہو لیکن اگر اس میں یہ چاروں خصلتیں ہیں تو میرے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مطابق اس کے ایمان کو ماننے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے خالص منافق ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

اگر ایسے شخص کو کوئی امانت سونپی جائے تو وہ اس میں خیانت کا مرتکب ہوگا۔ وہ امین ثابت نہیں ہوگا۔ امانت میں خیانت نہ کرنا خالصتاً ایمان کی نشانی ہے اور حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتِ عالیہ ہے۔ جو شخص خیانت کا ارتکاب کرے، اس میں منافقت کی ایک خصلت آ گئی اور جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے اور تائب نہ ہو جائے، اس سے بری نہیں ہوگا۔ بیہقی میں

حضرت صفوان بن سلیمؓ سے روایت ہے، حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مسلمان بزدل ہو سکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بخیل ہو اور اس میں ایمان موجود ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کذاب بھی ہو یعنی بہت زیادہ جھوٹا بھی ہو اور اس میں ایمان کی رمق بھی رہے۔ چنانچہ خالص منافق کی دوسری نشانی سرکارؐ نے یہ فرمائی کہ وہ باتیں کرے تو جھوٹ بولے۔

منافق کی تیسری نشانی یہ فرمائی کہ جب وہ شخص کسی سے کوئی عہد معاہدہ کرے گا تو اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ اور چوتھی نشانی یہ ہے کہ کسی سے لڑائی جھگڑے کے دوران بد زبانی کا مرتکب ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی میں یہ چاروں خصلتیں ہوں، اس کے خالص منافق ہونے میں کوئی شک نہیں یعنی اس میں اسلام کی رمق نہیں بلکہ وہ عملاً اسلام کو زک پہنچانے کے لیے مسلمان بنا ہوا ہے، دل سے مسلمان نہیں ہے۔ اگر وہ دل سے مسلمان ہوتا تو اسے علم ہوتا کہ خدا اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات برحق ہیں۔ اسلام کے احکام و قوانین اٹل ہیں اور مسلمانوں کو حق اور باطل کی پہچان کرا دی گئی ہے، انہیں بتا دیا گیا ہے کہ کیا کیا کام ان کے کرنے کے ہیں اور کن کاموں سے احتراز ان کے ایمان کی بنیادی ضرورت ہے۔

جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں یا مسلمان رہنا اور صاحبِ ایمان مرنا پسند کرتے ہیں، انہیں ان چاروں بُری خصلتوں میں سے کسی کے نزدیک نہیں جانا چاہیے، ورنہ خدا تعالیٰ کے فرمان کے مطابق دوزخ کا سب سے بُرا طبقہ ان کا منتظر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اگر ان چاروں میں سے کوئی ایک عادت کسی شخص میں پائی جائے تو سمجھ لیا جائے کہ اس میں یہ منافقانہ عادت آ گئی ہے اور اگر کسی میں یہ چاروں خصلتیں پائی جاتی ہوں تو اس کی خالص منافقت پر

ذرہ برابر شک نہیں ہونا چاہیے۔

اب ہم اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اپنے ماحول کو بھی کھنگالیں کہ ہم اسلام کے نام لیواؤں میں سے کون کون منافقت کی ان صفات سے کس قدر "متصف" ہے۔ میں یا میرے جاننے والوں میں سے کتنے ہیں اور ہمارے معاشرے کے کس قدر افراد ہیں جو امانت میں خیانت کے مرتکب نہیں ہوتے اور کون کون ہے جو مال و دولت اور جائداد وغیرہ کے حوالے سے دوسروں کی امانتیں اپنی جان سے زیادہ محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر کسی شخص کا کوئی راز اگر آپ کے پاس امانت کے طور پر ہے تو آپ اس کی کس حد تک حفاظت کرتے ہیں۔ اگر ہم میں اس پہلو سے ذرہ بھر بھی خیانت کا شائبہ نظر آتا ہو تو اپنے عمل پر نظرِ ثانی کر لیں اور منافقت کی اس نشانی کے پرتو سے بھی پرہیز کو شعار کر لیں۔

اب بات آتی ہے جھوٹ کی تو آج کے معاشرے میں کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا (الّا ماشاءاللہ)، وہ سچا نہیں ہے۔ پھر ہم کس منہ سے شکوہ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں دنیا کی قوموں میں عزت و افتخار سے کیوں نہیں نوازتا اور ہم ذلیل و رسوا کیوں ہو رہے ہیں۔ ہم خدا و رسولؐ کا کلمہ بھی پڑھیں، اسلام کے دعویدار بھی بنیں اور منکرات سے بچنے کی کوشش بھی نہ کریں تو ہم کیسے مسلمان ہیں۔ جھوٹ اتنا بولیں کہ اسے برائی سمجھنا بھی ہمارے لیے مشکل ہو تو ہم منافقت کی ایک بڑی نشانی کو نہیں اپنا رہے ہیں؟ ایمان کا نفاق نہ سہی کہ وہ تو کفر کی بدترین شکل ہوتا ہے، سیرت کی منافقت کو اپنا کر ہم ذلت و رسوائی کو تو خود اپنے دامن میں بھر رہے ہیں، کسی سے شکوہ کیسا۔

اسی طرح ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں اس کے متعلق قرآن و احادیث

کے احکام بھی معلوم ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے، یہ بھی علم ہے کہ یہ منافقت کی ایک نشانی ہے، پھر ہم کیوں غور نہیں کرتے کہ اس بُرائی کو مسلم معاشرے سے دور کرنا ضروری ہے۔

پھر یہ بات تو ہمارے روز مرّہ میں شامل ہے کہ ہم لڑائی جھگڑے کے دوران میں بدزبانی کے مقابلے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہے کوئی ایسا جو مخاصمت کے موقع پر دوسرے کو سب وشتم کا ہدف نہ بناتا ہو۔ دشنام ترازی نہ کرتا ہو۔ اتہام نہ تراشتا ہو۔ اگر ہم میں یہ خرابی بھی ہے اور کچھ زیادہ ہی ہے تو ہمارے ایمان کا کیا ہوگا۔

اور اگر خدانخواستہ ہم میں یہ چاروں خصلتیں موجود ہیں تو جس ہستی کو دشمن بھی سچا مانتے تھے ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق خالص منافق کون ہے!!۔

جس شخص سے بُرا اور کوئی نہیں

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَبْدٌ أَذْهَبَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهِ (سنن ابن ماجہ)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے، محبوب خالق و مطلوب خلائق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے بُرا وہ شخص ہے جو دوسرے کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت بگاڑ لے۔

آج کے معاشرے میں دنیا طلبی کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص دُنیوی وجاہت و ثروت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ہم میں سے جو لوگ بظاہر آخرت بنانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے، ان میں سے بھی بیشتر دراصل دنیا ہی بنا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے علمائے کرام جو ہمیں آخرت کی تیاری پر اُکساتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر تکبّر و نخوت کا نمونہ بنے ہوتے ہیں ـــــ یہ آخرت سنوارنے کے لچھن تھوڑی ہیں۔ عالمانِ دین میں سے اکثر زرق برق کپڑے پہنتے ہیں، مسجد میں بیٹھ کر غیبت کرتے اور سنتے ہیں، دوسرے مسلک یا گروہ کے لوگوں کے خلاف سازشیں تیار کرنے

میں شریک ہوتے ہیں، بُغض و کینہ کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو مسجد کی تعمیر و توسیع یا دارالعلوم کے قیام کے نام پر دینی خدمت انجام دیتے دیتے، دنوں میں امیر کبیر بن جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو تبلیغ کے لیے معاوضہ طے کرتے ہیں اور اپنے گلے کے زور پر یا دوسرے فرقوں یا مسلک کے خلاف دھواں دار تقاریر کرنے میں شہرت کی بنا پر روز بروز بینک بیلنس اور کاروں میں اضافہ کرتے جاتے ہیں ——— تو کیا یہ لوگ دنیا بنانے اور کمانے کے مجرم نہیں۔ ان کی زبانیں قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف رہتی ہیں اور اپنے سامعین اور مقتدیوں کو خوفِ خدا کی تلقین کرتے نہیں تھکتے لیکن خود طلبِ زر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جب ہمارے عالمانِ دین، مبلغینِ اسلام اور امامانِ ذی قدر کا یہ حال ہے تو دوسرے دنیا داروں کا کیا حال ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب (الا ماشاء اللہ) دنیا کمانے میں مصروف ہیں اور آخرت کی ہمیں کوئی فکر نظر نہیں آتی۔ یہ صورتِ حال بہت تشویشناک ہے۔ اللہ کریم نے اپنے محبوبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کر رکھا ہے فَلَا یُعَذِّبُهُمْ وَ اَنْتَ فِیْهِمْ (جب تک آپ ان میں ہیں، انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا) اس لیے ہم اجتماعی اور بڑے عذاب سے محفوظ ہیں ورنہ ہمارے کرتوت تو اس قابل ہیں کہ ہمیں غرق کر دیا جائے۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا سے پیار کرتا ہے، وہ اپنی آخرت کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے اور جو آدمی اپنی آخرت سے پیار کرتا ہے، وہ دنیا کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے۔ اس طرح ہم جو دن رات دنیا کمانے، مال و دولت اکٹھا کرنے، جاہ و منصب حاصل کرنے، اپنے آپ کو بڑھانے، اُجالنے اور اُچھالنے، دوسروں کو حقیر جاننے اور انہیں

ذلیل کرنے کی حماقتوں میں مصروف ہیں، حقیقت میں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔ سورۂ ہود میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "جو لوگ دنیا کی زندگی اور بس اُسی کی زینت اور آرائش چاہتے ہیں، ان کے کاموں کا بدلہ ہم ان کو اسی دنیا میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کو نقصان نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آخرت کی زندگی میں آگ کے سوا اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔" (ھود: ۱۵)

یعنی میں اگر دنیا کمانے اور اسے بنانے سنوارنے میں مشغول ہوتا ہوں، تو اپنی آخرت کا نقصان کر بیٹھتا ہوں۔ اور دنیا کمانے کی یہ خواہش میری ذات کے لیے ہے۔ لیکن اگر میں دنیا بھی کسی اور ہی کی بنانے سنوارنے کی کوشش کروں اور اپنی آخرت کا نقصان کر لوں تو ظاہر ہے کہ یہ "گناہِ بے لذت" کتنا بڑا ہے اور مجھ سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے۔ میں نے اتنی بڑی بُرائی اپنے ذمہ لی کہ اپنی آخرت تباہ کر لی اور صرف اس مقصد کے لیے کہ کسی دوسرے کی دنیا سنوار دوں۔ العیاذ باللہ۔

حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے ایک مرتبہ اپنے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے استفسار فرمایا کہ تمہیں اپنی دولت سے زیادہ محبت ہے یا اپنے وارثوں کی دولت سے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، ہم اپنی دولت سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ تو آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری دولت تو وہ ہے جو تمہارے کام آئے گی اور وہ نیکیاں ہیں۔ یہ دنیوی دولت تو تمہارے وارثوں کے کام آئے گی، اس سے محبت مت کرو ——— اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے وارثوں کے کام آنے والی چیز کے اکٹھا کرنے میں، عام طور سے، اپنی آخرت تباہ کر لیتے ہیں۔ ہمیں دنیا کی محبت ہو، ہم مال و دولت اکٹھی کرنے میں شبانہ روز مصروف رہیں تو ہم نے اپنی آخرت کا نقصان بھی کر لیا

اور یہ مال و دولت ہمارے وارثوں ہی کے کام آئی۔ یعنی ہم نے اپنی آخرت تباہ بھی کی تو اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے۔ اور آقا و مولا علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس شخص سے بُرا کوئی نہیں ہوگا جو دوسروں کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت بگاڑ لے۔

اپنے بیوی بچوں اور اہلِ خانہ کی سہولتوں کی خاطر، ان کے آرام و آسائش کے لیے جو شخص "ہیرا پھیری" کرتا ہے، اشیائے صرف میں ملاوٹ کا مرتکب ہوتا ہے، جھوٹ بول کر اور کم تول کر کماتا ہے، اپنی منصبی ذمہ داری کو پوری طرح دیانت و امانت کے احساس کی گہرائی کے ساتھ نہیں نبھاتا، زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، حرام ذرائع سے کماتا ہے، رشوت دیتا ہے یا لیتا ہے اور کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منع فرمایا ہے —— تو ایسا شخص دوسروں کے لیے دنیوی آسائشیں مہیا کرنے کی خاطر اپنی آخرت بگاڑ رہا ہے اور ارشادِ نبویؐ کے مطابق، قیامت کے دن اس سے بُرا آدمی اور کوئی نہیں ہوگا، سب سے بُرا آدمی یہی ہوگا۔

آج کے معاشرے میں اپنے اہلِ خاندان کے لیے دنیا کما کر اپنی آخرت خراب کرنے والے تو بہت ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اُن لوگوں کے لیے اپنی آخرت بگاڑ لیتے ہیں جن سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ آپ اپنے ماحول پر نگاہ دوڑائیے کتنے ہی لوگ آپ کو جعلی ویزوں کے کاروبار میں ملوث نظر آئیں گے، کئی "مسلمان" ملاوٹ کے کاروبار میں اعضاء و جوارح کی حیثیت سے کام کرتے دکھائی دیں گے کہ دولت تو کوئی امیر سمیٹ رہا ہے، یہ اس کے کارندوں کی حیثیت سے ایک معمولی تنخواہ پر اس جرم میں حصہ دار بنتے ہیں۔ پھر ایسے کتنے ہیں جو آپ کو

جعلی پاسپورٹ بنوانے اور جعلی سندیں دلوانے کا "کاروبار" کرتے ہیں، یہ لوگ بھی اپنے سے زیادہ دوسروں کے جُرم میں اپنی عاقبت گنواتے ہیں۔

چونکہ اسلامی تعلیمات ہماری رگ و پے میں سمائی ہوئی نہیں ہیں، ہم نے احکام و ارشاداتِ خدا و رسول (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی زندگیوں پر وارد نہیں کیا ہے، اس لیے ہم کوئی "گناہ" کرتے ہوئے اب احساس بھی نہیں کرتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، ہم سے کتنا بڑا جُرم سرزد ہو رہا ہے اور اس کی سزا کتنی کڑی ہوگی۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں اب یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کوئی خلافِ احکامِ اسلام کام کرنے لگتا ہے تو دوسرا شخص محض "تفنّنِ طبع" کی خاطر یا دوستی کے خیال سے اس کام میں شریک ہونا یا گواہ بننا قبول کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ زیرِ نظر حدیثِ پاک کے مطابق قیامت میں ان آدمیوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے جو سب سے بُرے ہیں۔ اللہ کریم، ہمیں اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحمت کے طفیل اس زمرے میں شامل ہونے سے بچائے رکھے۔ آمین۔

بائع اور مُشتری

وعن حکیم ابن حزام قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم البیعان بالخیار ما لم یتفرقا، فان صدقا و بینا بورك لهما فی بیعهما، وان کتما و کذبا محقت برکة بیعهما

حضرت حکیم ابن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، حضور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے فرمایا کہ خریدار اور فروخت کرنے والا جب تک جُدا نہ ہوں، اختیار رکھتے ہیں۔ اگر خریدنے اور بیچنے والا دونوں سچ بولیں اور چیز کی حقیقت بیان کر دیں تو ان کی بیع میں برکت دی جاتی ہے۔ اور اگر چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی بیع کی برکت مٹا دی جاتی ہے۔

اس متفق علیہ حدیث پاک میں حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت کے اصول متعین فرما دیے ہیں۔ اسلام کی یہی تو خصوصیت ہے کہ اس جامع نظامِ حیات میں زندگی گزارنے کے تمام رہنما اصول متعین کر دیے گئے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کیسے زندگی گزارنا

ہے، ہمیں کمائی کن ذرائع سے کرنا ہے اور خرچ کن کن مقامات پر جائز ہے۔ اپنوں کے ساتھ لمحاتِ زیست بسر کرنے کی راہ کیا ہے اور دشمنوں کے ساتھ کس انداز میں سلوک کرنا ہے۔ ہماری انفرادی حیثیت ہماری اجتماعی زندگی سے الگ نہیں ہے اور ہمیں اپنے سلوک سے، اپنے طرزِ زندگی سے، اپنے معیارِ حیات سے ایک صالح اور پُرسکون معاشرہ تعمیر کرنا ہے جس میں محبت ہی محبت ہو جس میں دشمنیاں اور شکر رنجیاں نام کو نہ ہوں، جس میں طمانیت و استحکام کا دور دورہ ہو۔ اس سلسلے میں آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُسوۂ حسنہ کے ذریعے اور اپنے ارشاداتِ عالیہ کی وساطت سے ہمیں زیست کے ہر شعبے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ زیرِ نظر حدیث مبارک میں یہ اُصول وضع فرما دیا گیا ہے کہ خریدار اور فروخت کرنے والا جب تک ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو جائیں، اختیار رکھتے ہیں کہ خرید و فروخت کے معاملے کو باقی رکھیں یا فسخ کر دیں۔ لیکن جب وہ اس جگہ سے ہٹ جائیں تو سودا پکا ہو جائے گا اور اس کے بعد سودا منسوخ کرنے کا اختیار نہیں رہے گا۔ ہاں، اگر کوئی شرط طے کر لی گئی تو وہ باقی رہے گی۔ مثلاً سودا کرتے وقت کسی کے پسند آ جانے کی شرط طے کر لی گئی تو اس جگہ سے ہٹ جانے پر بھی اگر پسند کرنے والے نے وہ چیز پسند نہیں کی تو وہ سودا نہیں ہوا۔ البتہ کوئی شرط طے کیے بغیر اگر کوئی شخص بیچنے والا یا خریدنے والا سودے سے مُکرتا ہے تو وہ خدا و رسولِ خدا (جل شانہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کا مجرم ہوگا۔

صحیحین میں منقول اس حدیث پاک میں جو دوسری اہم بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر چیز خریدنے اور بیچنے والے سچ بولیں اور چیز کی حقیقت بیان کریں تو سودے میں برکت ہوگی اور دوسری صورت میں کہ وہ حقائق کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو سودے میں برکت نہیں رہے گی۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہر حالت میں سچ بولنے کی تلقین فرمائی ہے اور مختلف مواقع پر سچ بولنے کے نتیجے میں ہونے والی اچھائیوں کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کے بُرے نتائج سے بھی اعلان کر دیا ہے۔ خداوندِ کریم نے جھوٹوں پر لعنت کی ہے اور ان کے عبرتناک انجام کی نشان دہی بھی فرما دی ہے۔ دنیوی لحاظ سے جھوٹ بول کر فائدے حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والوں کو بھی قرآن و احادیث میں بتا دیا گیا ہے کہ ان کی سوچ غلط ہے۔ انہیں خدا اور رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی پر تو سزا دی ہی جائے گی، دنیا میں بھی فائدہ حاصل کرنے کی ان کی خواہش بارآور نہ ہو گی۔

ہم اگر جھوٹ بولتے ہیں تو اس لیے کہ اس سے ہمیں فلاں فائدہ ہو گا اور سچ بولنے سے فلاں فلاں نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ ہماری سوچ کا غلط انداز ہے۔ حضور رسول انام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مثلاً زیرِ نظر حدیث پاک میں واضح طور پر فرما دیا ہے کہ سودا کرتے وقت بیچنے والے اور خریدنے والے، دونوں کو سچ بولنا چاہیے۔ اگر وہ سچ بولیں اور چیز کے بارے میں صحیح صورتِ حال بتائیں تو سودے میں برکت ہو گی، اس میں بیچنے اور خریدنے والوں کے لیے نفع ہو گا۔ دوسری صورت میں برکت اُٹھالی جائے گی یعنی سودا کرتے وقت بائع یا مشتری یا دونوں جھوٹ بولتے ہیں اور چیز کے بارے میں حقائق چھپاتے ہیں تو جہاں وہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اور اس کے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اُخروی زندگی میں اس حرکت کے خراب نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، وہاں دنیوی لحاظ سے بھی جن فائدوں کی خاطر انہوں نے یہ جرم کیا ہے، ان سے بھی محروم ہوں گے، فوری طور پر یا آگے چل کر انہیں معلوم ہو گا کہ خدا تعالیٰ نے ان کی اس حرکت کی

وجہ سے سودے میں سے برکت اُٹھالی ہے۔

ہم آج کے ماحول پر نگاہ ڈالیں تو ہمارے آس پاس، دوکاندار اپنی چیزیں بیچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں، سودے کی خامیوں کو چھپاتے ہیں بلکہ اگر گاہک کو شک ہو جائے تو اس کی تردید کرتے ہیں، اور اسے ہر طرح سے بہترین قرار دے کر زیادہ سے زیادہ پیسے بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ کم قیمت چیز کے دام تو زیادہ وصول کر لیتے ہیں لیکن حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کے ارشادِ گرامی کے مطابق دوکاندار کے جھوٹ بولنے اور مال کے بارے میں حقائق چھپانے کی وجہ سے اس سودے سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ہم جب کوئی چیز خریدنے جاتے ہیں تو بسا اوقات جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوتے ہیں کہ یہی چیز وہ دوسرا دوکاندار تو اتنے کم پیسوں میں دیتا ہے۔ یا اس چیز میں تو فلاں فلاں قسم کا عیب ہے، اس لیے اس کی قیمت کم ہونا چاہیے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ پاک کی رُو سے ایسا کرتے وقت ہم جہاں خدا اور رسولؐ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لے رہے ہوتے ہیں، وہاں اس سودے کی برکات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ہم گاہک ہیں یا دوکاندار، کوئی چیز خریدنے والے ہیں یا بیچنے والے ہمارے لیے ضروری ہے کہ سچ بولیں، مال کے بارے میں حقائق بیان کریں، حقائق کو نہ چھپائیں۔ کہ اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اپنی دنیا و آخرت خراب کر بیٹھیں گے۔

نیکی کیا ہے اور گناہ کیا

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ (صحیح مسلم)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا، نیکی حُسنِ اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جس سے تیرے ضمیر میں خلش پیدا ہو اور تجھے اس کا لوگوں پہ ظاہر ہونا ناگوار ہو۔

اسلام نے مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے نیکیاں کرنے کی تلقین کی ہے اور بُرائیوں سے بچنے کے لیے کہا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں پوری وضاحت سے بتا دیا گیا ہے کہ کون کون سے کام نیکیوں میں شمار ہوتے ہیں اور کن کن کاموں سے احتراز ضروری ہے کہ وہ گناہ ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایمان کی ستر سے بھی کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سے سب سے اعلیٰ تو توحید کی شہادت

دینا ہے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستے سے اذیت یا تکلیف دینے والی چیزوں کو ہٹا دیا جائے۔ اور حیا ایمان کی شاخ ہے۔ مسند احمد میں ہے، آقا حضورؐ نے فرمایا کہ جب تمہیں اپنے عمل سے خوشی ہو اور بُرے کام سے رنج ہو تو تم مومن ہو۔

سب سے بڑی نیکی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی جائے اور جس آدمی کو خدا و رسولؐ کے ساتھ دلی محبت ہو گی، وہ خود بخود نیکیوں کی طرف راغب ہو گا اور بُرائیوں سے بچے گا۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "جو لوگ مومن ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت خدا تعالیٰ سے کرتے ہیں" متفق علیہ حدیث پاک میں ہے لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بخاری ومسلم) کہ تم میں سے کوئی شخص صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ کرتا ہو۔ یہی بات سورۂ توبہ میں مزید وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ جس قوم کو ماں باپ، اولاد، بھائی، بیویاں، کنبہ قبیلہ، مال و دولت، تجارت، مکانات وغیرہ سے زیادہ محبوب اللہ، اللہ کے رسولؐ اور اللہ کی راہ میں جہاد محبوب نہ ہو، "وہ قوم الفسقین ہے"۔

پھر فرامینِ خدا اور رسولؐ میں خوفِ خدا کی اہمیت ہے، تقویٰ کو فضیلت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ دنیا کے بے وقعت بتا کر اس سے محبت نہ کرنے کی تلقین ہے۔ حُبِّ مال اور طلبِ جاہ و منصب کی ممانعت کی گئی ہے۔ فقر و زہد کی ہدایت ہے۔ رحمدلی کو اپنانے اور بے رحمی سے بچنے کو کہا گیا ہے۔ انتقام نہ لینے اور معاف کر دینے والوں کو محسنین فرمایا گیا ہے۔ احسان و ایثار کرنے اور اُنس و محبت اور اخوت کے جذبے کے ساتھ زندگی گزارنے کو بہت بڑی

نیکی بتایا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ بیگانگی، عداوت، نفرت، بدگمانی، حسد، بدزبانی، بغض و کینہ، درشت خوئی، کذب، خیانت، چغلخوری، غیبت، بہتان، وعدہ خلافی، تکبر، بغض و طمع، ریا اور جلد بازی سے باز رہیں۔ اور دینی اخوت، اسلامی ہمدردی، نرم مزاجی، حلم، بُردباری، متانت، خوش کلامی، صدق و امانت، تواضع، شرم و حیا، قناعت پسندی، صبر و شکر، توکل اور اخلاص کو اپنائیں کہ نیکیوں کو اپنانا اور بُرائیوں سے احتراز کرنا ہی اسلام پر عمل پیرا ہونا ہے۔

اسی طرح خدا و رسولِ خدا (جل وعلا و صلی اللہ علیہ وسلم) نے زندگی کے ہر مرحلے پر رہنمائی فرمادی ہے کہ ہمیں کیا کیا کام کرنے ہیں اور کن کن کاموں سے بچنا ہے۔ ہمیں عبادات اور حقوق اللہ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا گیا ہے اور حقوق العباد کی اہمیت کو ہم پر واضح کر دیا گیا ہے کہ حقوق العباد میں اگر خامی رہ گئی تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں ہو گی۔ ماں باپ کو اولاد کے حقوق بتا دیے گئے ہیں، بچوں پر والدین کے حقوق واضح کر دیے گئے ہیں، دوسرے قرابت داروں کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں، ہمسایوں کے حقوق اور فرائض، کمزوروں، محتاجوں، یتیموں، بیواؤں، غلاموں، زیردستوں اور عام مسلمانوں کے حقوق اور عام مخلوقات کے حقوق بتا دیے گئے ہیں۔

اگر ہم یہ حقوق ادا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں تو ہم نیکیوں کے حامل بنتے ہیں اور اگر اس میں ناکام ہو جاتے ہیں تو گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

غرض ہماری معاشرت، معیشت، سیاست و حکومت اور دیگر نظام ہائے زندگی میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے، وہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ نیکی ہے اور جس جس پہلو

سے ہمیں اپنا آپ بچانا ہے، وہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ گناہ ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں جگہ جگہ موجود ہے اور ایک ایک بات کھول کر بیان کر دی گئی ہے لیکن زیرِ نظر حدیث پاک میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیکی اور گناہ کی تعریف اس اجمال کے ساتھ بیان فرما دی ہے کہ اس پر ہزاروں تفصیلات و جزئیات قربان کی جا سکتی ہیں۔

حضرت نواس رضی اللہ عنہ نے اپنے آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) سے پوچھا کہ نیکی اور گناہ کسے کہتے ہیں تو آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیکی کی تعریف میں فرمایا کہ اچھے اخلاق نیکی ہے اور جس کام سے انسان کے ضمیر میں خلش پیدا ہو اور اس کا لوگوں پر ظاہر ہونا اسے اچھا نہ لگے، وہ گناہ ہے۔ ہر ایسا کام جو حُسنِ اخلاق کی ذیل میں آتا ہے، نیکی ہے اور ہر وہ کام جس کے سرزد ہونے سے انسان کے ضمیر میں چبھن ہو اور خلش پیدا ہو اور انسان اسے لوگوں سے چھپائے اور کسی اور کا اس پر مطلع ہونا اسے گوارا نہ ہو، وہ گناہ ہے۔

حُسنِ اخلاق کے حوالے سے آپ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، اقربا اور پڑوسیوں سے محبت اور اخوت کا برتاؤ کرتے ہیں، معذوروں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، اپنے مسلمان بھائی کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، اس کی خوشی میں مسرور ہوتے ہیں، اس کو تکلیف ہو تو اس کی مدد کرتے ہیں، غصہ آئے تو اسے پی جاتے ہیں، لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، مسلمان بھائی کی جان و مال و آبرو کا احترام کرتے ہیں —— اور ہر انسان کے ساتھ حُسنِ اخلاق کی الوہی اور نبوی ہدایات کے تحت تعلق رکھتے ہیں تو آپ ہر قدم پر نیکیاں کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس میں عبادت نہیں کرتا، لوگوں کے حقوق غصب کرتے ہیں

کوشاں ہوتا ہوں، کسی کو مارتا پیٹتا ہوں، کسی کے قتلِ عمد کا مرتکب ہوتا ہوں۔ اپنے مسلمان بھائیوں میں سے کسی سے عداوت رکھتا ہوں، حسد کرتا ہوں، بدزبانی کرتا ہوں، جھوٹ بولنے کی عادت میں مبتلا ہوں، وعدہ خلافی کرتا ہوں، حرص اور طمع کے چنگل میں گرفتار ہوں، بغض اور کینہ سے اپنے سینے کو ملوث کیے ہوئے ہوں۔ امانت میں خیانت کر بیٹھتا ہوں، چغلی کھانے کی عادت رکھتا ہوں یا ریاکاری کا جرم کرتا ہوں —— تو یا تو ان میں سے کسی کام کے ارتکاب کے ساتھ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، مجھے ضمیر کی خلش یا چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ اگر میرا ضمیر زیادہ ہی مردہ ہو چکا ہو اور اس کی خلش یا چبھن کی نوبت بھی نہ آتی ہو تو پھر یہ بات تو بہر حال ہے کہ کسی اور کا میرے ان جرموں یا ان میں سے کسی ایک کام سے مطلع ہونا مجھے گوارا نہیں ہوتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو میرے جھوٹ کا علم ہو اور کوئی میری چوری یا قتل یا غنڈہ گردی یا حرص و طمع سے واقف ہو۔ یا اگر کسی کو میری کسی ایسی حرکت کا پتا چل جائے اور کچھ لوگ مجھ سے پوچھیں تو میں کسی طرح اس کا اعتراف نہیں کرتا —— سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کی توفیق بخشے اور گناہوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

قتلِ ناحق

عَنْ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ قَالَ لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَھْوَنُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِغَیْرِ حَقٍّ۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، حضور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ تمام دنیا کا بگڑ جانا اللہ کے نزدیک ایک مومن کے ناحق قتل ہو جانے سے زیادہ آسان ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

حضور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مومن کے قتلِ ناحق کو تمام دنیا کے تباہ ہو جانے سے زیادہ بُرا قرار دیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے جس چیز کا فیصلہ کیا جائے گا، وہ خون ہوگا یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے قتلِ ناحق کے مرتکب کو سزا دی جائے گی۔ خود خداوند کریم نے سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ "جس کسی کو جان سے مارنا خدا نے حرام کر دیا ہے، اسے ناحق قتل نہ کرو۔" سورۃ المائدہ میں تو ایک انسان کے قتل کو انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیتے ہوئے ارشادِ خداوندی

ہے۔" جو شخص کسی کو کسی کی جان کے عوض کے بغیر، یا زمین میں فساد پھیلانے کے عوض کے بغیر مار ڈالے، تو گویا اس نے سارے انسانوں کو مار ڈالا اور جس نے ایک جان کو بچا لیا، اس نے گویا سارے انسانوں کو زندگی دے دی۔" مراد یہ ہے کہ قاتل یا فسادی کو تو اس کے فعل کے مکافات کے طور پہ مارا جا سکتا ہے لیکن کسی شخص کو ناحق قتل کر دینا ساری دنیائے انسانیت کو مار ڈالنے کی طرح ہے۔

خداوند قدوس و لایزال اور اس کے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خونِ ناحق سے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے اور اس فعل کی سنگینی اس بات سے ظاہر ہے کہ خدا و رسولِ خدا (جل شانہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر میں ایک مومن کے قتلِ ناحق کا جرم ساری دنیا کے بگڑ جانے کی برائی سے بڑھ کر ہے پھر، کیا ہم اسلام کے نام لیواؤں نے کبھی احساس کیا ہے کہ ہماری زبانیں خدا و رسولؐ کے ذکر سے لال ہوتی ہیں، ہم اسلام کی حقانیت کے مسئلے پر بحث و تمحیص بھی کرتے ہیں اور خامہ فرسائی بھی۔ لیکن ہمارے معاشرے میں دن رات قتلِ ناحق کی وارداتیں ہوتی ہیں، ہمارے اخبارات ہر صبح ایسی کئی خبروں کے ساتھ طلوع ہوتے ہیں جن میں زندگیوں کے کسی ظالم کے ہاتھوں غروب ہونے کی اطلاع ہوتی ہے۔ بیویاں خاوندوں کو قتل کر رہی ہیں، قتل کروا رہی ہیں، شوہروں کی طرف سے بھی اسی قسم کی خبروں کی شنید ہے۔ فلاں نے فلاں کو گولی مار دی، اس نے اس کا گلا کاٹ دیا، کسی نے حالات کے ہاتھوں شکست کھا کر، کسی نے محبت میں ناکام ہو کر، کسی نے عسرت سے تنگ آ کر، یا کسی اور وجہ سے اپنے ہاتھوں اپنا قتل کر دیا۔۔۔۔ آخر انسانی جان اتنی سستی کیسے ہو گئی ہے جو اپنی یا کسی دوسرے کی جان لے لینا شرفِ انسانیت کی توہین ہے اور یہ بات خالق و مالکِ حقیقی کو کسی طرح پسند نہیں۔

اسلام تو امن اور سلامتی کا پیغام ہے۔ مسلمانوں کو تو کسی انسان کو تکلیف پہنچانے کی بھی ممانعت ہے۔ ہمیں تو حکم دیا گیا ہے کہ ہم کسی دوسرے مسلمان کو ذہنی، جسمانی یا روحانی تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہ کریں کہ اگر ہماری نیت میں یہ بات داخل ہو گئی تو بھی ہمارے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اسلامی معاشرہ تو محبت و اخوت کی بنیاد پہ قائم ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ میں آپ کے اور آپ میرے درپے آزار ہوں تو ہم کیسے مسلمان ہیں۔۔؟

یا تو مان لیجئے کہ ہم گفتار کے حصار میں ہیں، اپنی گفتار کو کردار کے دائرے تک لے جانا پسند نہیں کرتے۔ ہم نام کے مسلمان ہیں، ہمارا اسلام سے برائے نام تعلق ہے، ہم خدا تعالیٰ کو اپنا مالک و مختار اور مالکِ حقیقی کہتے ہیں، سمجھتے نہیں۔ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ ہے، جو مبنی بر حقیقت نہیں۔ ہم خدا و رسولؐ پر ایمان کا اقرار تو کرتے ہیں، اس اقرار کا دائرہ زبان سے قلب و ذہن تک نہیں پھیلاتے۔ تسلیم کر لیجئے کہ ہم مسلمان کہلاتے ہیں، ہیں نہیں۔۔۔۔ اور اگر ایسا تسلیم کر لینا مشکل ہے تو پھر خدا و رسولؐ کا حکم مانیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں فرمایا۔" اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا دوزخ ہے۔ اسی میں ہمیشہ پڑا رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت! اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا گیا ہے۔"

میں اگر قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہوں، خدا کو قادر و توانا تسلیم کرتا ہوں، اس کے احکام کو اٹل جاننے کا اعلان کرتا ہوں تو پھر قتلِ عمد کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں کہ خدا کے غضب، اس کی لعنت اور عذاب کو دعوت دینا کسی

مسلمان کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا، جسے قتل کرنے کی اجازت نہ ہو، ان شدید قسم کی آفتوں میں سے ہے کہ جس نے اپنے آپ کو ان میں ڈال دیا، اس کے لیے نکلنے کی کوئی راہ نہیں"۔ میں اگر خدا کو اس کی تمام صفات کے ماننے کا دعویدار ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا پیغامبر مانتا ہوں تو اپنے آپ کو ایسی آفتوں کی نذر کرنے کی حماقت کیسے کر سکتا ہوں، جن سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔ بخاری شریف ہی میں حضرت جندبؓ سے روایت ہے، حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے فرمایا کہ کسی کا ناحق بہایا جانے والا چلّو بھر خون، بہانے والے اور جنت کے درمیان حائل رہے گا۔ پھر میں کیسا مسلمان ہوں کہ اپنی زندگی بھر کی نیکیوں سمیت کسی کا چلّو بھر خون بہانے کی پاداش میں جنت سے دور رہنا اچھا سمجھتا ہوں۔

اور نیکیاں بھی کیسی۔ نسائی شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عزت کی خاطر کسی کو قتل کرتا ہے، اس کی فردِ عمل مقتول کے گناہوں سے بھر جاتی ہے۔ تُف ہے ایسوں کی بے عقلی پر جو اپنا دامن دوسرے کے گناہوں سے بھر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے جنت سے دور ہو جاتے ہیں۔

بخاری شریف (کتاب الدیات) اور سنن ابوداؤد (کتاب الحدود) میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ جان کے بدلے جان لی جا سکتی ہے، شادی شدہ زنا کرے تو اسے سنگسار کر دیا جائے اور مسلمان اپنا دین چھوڑ کر جماعت سے الگ ہو جائے یا کوئی اللہ اور رسولؐ سے لڑنے کے لیے نکلے تو اسے قتل کیا جائے۔ ان باتوں کے علاوہ کسی بات پر خون بہانا جائز نہیں ہے۔ ہمارے اخبارات میں ہر روز جن قتلوں کی خبر

ہوتی ہے، کیا وہ ان تین باتوں کے علاوہ کسی وجہ سے نہیں ہوتے۔ تو پھر ہم کیسے مسلمان ہیں، ہمارے ایمان کیا ہوئے، ہماری عقلوں پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں "مظالم میں سب سے بڑا جرم کسی کو بے گناہ قتل کرنا ہے۔ سب ادیان و ملل کا اس پر اتفاق ہے کہ قتلِ عمد سب سے بڑا گناہ ہے۔ کسی کو قتل کرنا خواہشِ غضب میں نفس کی اطاعت کرنا ہے اور لوگوں کے آپس کے تعلقات بگاڑنے کا سب سے بڑا ذریعہ اور فساد کا سرچشمہ ہے۔ اس کی حقیقت اللہ کی تخلیق کو بگاڑنا اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو ڈھانا ہے"۔ یعنی قتلِ عمد سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور ہمارے معاشرے میں یہ روزمرہ کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے تو یہ معاشرہ کیا ہوا۔ اس کے باسی کیسے کلمہ گو ہیں۔ قتل فساد کا سرچشمہ ہے تو ہم کتنے بڑے فسادی ہو گئے ہیں اور مسلمان کیسے فسادی ہو سکتا ہے۔ مسلمان کو تو ایک صالح اور پُرامن معاشرہ تخلیق کرنا تھا، اسے تو محبت اور بھائی چارے سے زندگی گزارنا تھی تاکہ دنیا کے لیے مثال ہو، پھر ہم کس طرف رُخ کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کرتا ہے اور ہم قتلِ عمد کے حوالے سے اس کی تخلیق کو ڈھانے کا عمل کرتے ہیں تو خدا کے غضب کو دعوت ہی تو دیتے ہیں۔ مگر ایسا ہونا تو نہیں چاہیے نا! اگر ہم قادرِ مطلق کے غضب کو دعوت دیتے ہیں تو پھر دنیا و آخرت میں ہمارے لیے جائے فرار کہاں ہے؟

سورۂ نساء میں ارشادِ خداوندی ہے "کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ مسلمان کو مار ڈالے مگر غلطی سے مار ڈالے تو اور بات ہے"۔ امام اعظم ابوحنیفہ حضرت نعمان بن ثابت رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتلِ عمد وہ ہے جو قصداً اور ارادۃً کسی دھار دار ہتھیار سے اور قتل کرنے کے ارادے سے قتل کیا جائے،

یا ایسی چیز سے جو دھار دار آلے کے قائم مقام ہو، جیسے دھار دار لکڑی، بانس کا پھرٹا، پتھر کا باریک دھار دار کنارہ، یا مثلاً آگ میں جلا دینا، بجلی کے کرنٹ اور زہر سے ہلاک کرنا۔ اور اس قتل کو قتل عمد اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ عمد کے معنی قصد اور ارادہ کے ہیں" (ہدایہ)

ہمارے معاشرے میں قتلِ مومن کا جرم عام ہوتا جا رہا ہے اور یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ کیونکہ یہ سب معاشرے کے خدا و رسولؐ اور ان کے احکام سے دور ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "جو شخص ایک صاحب ایمان کے قتل میں آدھی بات کہہ کر بھی مدد کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا کہ "یہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید ہے"۔ (سنن ابن ماجہ) ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے قتل کے بدلے میں پانچ یا سات آدمیوں کو قتل کیا، یہ سب لوگ اس کے قتل میں شریک تھے اور انہوں نے دھوکہ دے کر اسے قتل کیا تھا —— یعنی قتلِ مومن میں اعانت بھی بہت بڑا جرم ہے۔ قتل میں جتنے بھی شریک ہوں گے، ان سب کے لیے سزائے موت ہونی چاہیے۔ اور اگر کوئی آدمی اس قتل میں ایک آدھ بات کہہ کر بھی مددگار رہا، تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا قطعاً حق دار نہ رہا۔ افسوس ہے کہ اتنی وعیدیں بھی ہماری سوچ کے دھارے کو مثبت سمت میں نہیں موڑ سکیں، ہمارا قبلہ راست نہیں ہو سکا اور ہم ایک دوسرے کو مارنے کے جرم سے نہیں نکلتے۔

صحیحین میں کئی حدیثیں ملتی ہیں جن میں کسی مسلمان کی طرف لوہے سے اشارہ کرنا بھی جہنم اور فرشتوں کی لعنت کا حق دار بنا دینے کی خبر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے ہم پر ہتھیار اُٹھایا، وہ ہم

میں سے نہیں ہے (صحیح مسلم)

اصل میں اسلامی معاشرے میں فرد کی عزت و احترام اور افراد کا آپس میں بھائی چارہ اور محبت سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور قتل تو یہ حیثیت رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس کو زندگی بخشی، کوئی فرد اس کی زندگی چھین رہا ہے۔ انسانی زندگی کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ اس کو بچانے کے لیے حرام چیزوں کو بھی کھایا جا سکتا ہے۔ انسانی زندگی کو جو بھی ضائع کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ کسی دوسرے کی زندگی کو ضائع کرنے کی طرح اپنی زندگی کو ختم کرنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ بخاری میں منقول کئی احادیث میں خودکشی کے جرم کی سنگینی کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے خودکشی کر لی تو سرکارؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا گوارا نہ فرمایا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم تکریمِ انسانیت کے اس سبق کو حرزِ جاں بنا لیں جو ہمیں ارشاداتِ باری تعالیٰ اور فرموداتِ محبوبؐ باری تعالیٰ سے ملتا ہے۔ اپنی نہ کسی اور کی جان کو ضائع کرنے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھیں۔ اگر معاشرے میں کہیں بگاڑ پیدا ہو رہا ہو جو کسی کی جان جانے پر منتج ہو سکتا ہو، تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں اور یہ جان لیں کہ کسی کو قتل کرنا اور اس کام میں کسی طرح معاونت کرنا، ایک آدھ بات کے ذریعے ہی اس جرم کی حوصلہ افزائی کرنا خدا و رسولؐ خدا کو پسند نہیں ہے۔ اور اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک مومن کے ناحق قتل سے، تمام دنیا کا بگڑ جانا اور تباہ ہو جانا زیادہ آسان ہے اور ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔

بہترین اور بدترین شخص

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ عَلٰی نَاسٍ جُلُوْسٍ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ۔ فَقَالَ فَسَكَتُوْا فَقَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ رَجُلٌ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا بِخَیْرِنَا مِنْ شَرِّنَا، فَقَالَ خَیْرُكُمْ مَنْ یُّرْجٰی خَیْرُهٗ وَلَا یُؤْمَنُ شَرُّهٗ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، صحابہ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کھڑے ہوکر فرمایا، کیا میں تم میں سب سے بُرے آدمی کے بارے میں بتاؤں؟ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر تمام صحابہ خاموش بیٹھے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہی الفاظ فرمائے تو ایک شخص نے عرض کیا، ہاں یارسول اللہ! ہم میں سے نیکوں اور بُروں میں امتیاز فرمادیجئے۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جس کی بھلائی کے لوگ متوقع اور اُمیدوار ہوں اور اُس کے شر سے محفوظ و مامون زندگی گزارتے ہوں۔

ترمذی شریف کی اس حدیث پاک میں حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ نے خیر اور شر، اچھائی اور بُرائی میں امتیاز فرمادیا۔ اچھوں کی تعریف فرمادی کہ اُن کی اچھائی اتنی ضرب المثل بن جاتی ہے کہ لوگ اُن سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں اور

لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ اُن سے کسی موقع پر بُرائی سرزد ہوجائے گی اور وہ کسی انسان کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جن کے رویّوں کی وجہ سے لوگ ان سے بھلائی کی توقع نہ رکھتے ہوں اور اُن کے شر سے محفوظ زندگی نہ گزارتے ہوں، بُرے لوگ ہیں۔

حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق "خیر" یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ہر آدمی کے ساتھ نیکی کرے اور کبھی کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرے تاکہ نیکی اس کی شخصیت کا لازمہ بن جائے اور اُس کا نام آتے ہی ہر شخص یہ گواہی دے کہ وہ کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کرے گا، وہ ہر ایک کے ساتھ حُسنِ سلوک ہی سے پیش آئے گا۔

اصل میں اسلام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اہلِ اسلام ایک پاکیزہ اور محبت و اُخوت سے بھرپور معاشرہ تشکیل دیں۔ آپس میں دشمنیاں جنم نہ لیں، شکر رنجیاں پیدا نہ ہوں، مخالفتیں اور مخاصمتیں اپنے منحوس سائے نہ پھیلائیں۔

مقصد یہ ہے کہ مسلمان ایک طرف تو خدا تعالیٰ سے مضبوط تعلق قائم رکھے اور دوسری طرف انسانوں کے ساتھ ایثار و خلوص کا تعلق قائم رکھے۔ ترمذی شریف میں ارشادِ مصطفوی ہے کہ قیامت کے دن حُسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری چیز اور کوئی نہیں ہوگی۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، سرکارؐ نے فرمایا کہ تم میں سے مجھے سب سے زیادہ عزیز وہ ہے جس کا اخلاق تم میں، سب سے زیادہ اچھا ہو۔ سُنن ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اُس کا ہے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا مالک ہو ——— یعنی جو مسلمان معاملات میں اچھا ہے، دوسرے مسلمانوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے، کسی کو کسی طرح دکھ نہیں پہنچاتا، ہر مسلمان بھائی کے کام آنے کی کوشش کرتا ہے، لوگوں کی غلطیوں،

خامیوں، کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہے، کوئی زیادتی کر بیٹھے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ دوسروں کی عیب پوشی کرتا ہے۔ خدمتِ خلق کو شعار بنالیتا ہے۔ تواضع اور انکسار اس کی شخصیت کا جُزبن جاتے ہیں۔ کینہ، بُغض، حسد، غُصّہ، تکبّر و غرور، جھوٹ، بدزبانی، چغلی، جھگڑالوپن اور دوسری بُرائیوں سے ہمیشہ بچتا ہے، اور ـــــ یہ ساری باتیں اس کی شخصیت کا لازمی جُزبن جاتی ہیں اور ان خصوصیات کی وجہ سے لوگ اس سے بھلائی کی توقع کرتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہ ہر شخص سے بھلائی ہی کرے گا، اس سے کسی زیادتی کا تصور تک لوگوں کو نہیں ہوتا۔ آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا آدمی مسلمانوں میں بہترین ہے ـــــ اللہ کریم ہمیں حُسنِ اخلاق کی دولت سے نوازے۔ آمین۔

بے عمل مبلّغین کا انجام

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُهُ فِي النَّارِ فَيَدُوْرُ كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ أَيْ فُلَانُ مَا شَأْنُكَ أَلَيْسَ كُنْتَ تَأْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ قَالَ كُنْتُ اٰمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَأَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ (بخاری۔ کتاب بدء الخلق)

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی لایا جائے گا اور اسے آگ میں ڈالا جائے گا۔ بہت جلد دوزخ میں اس کے پیٹ کی آنتیں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان کے گرد اس طرح چکّر لگائے گا جس طرح گدھا چکّی کے ارد گرد چکّر لگاتا ہے۔ اہلِ دوزخ اس کے گرد جمع ہو کر اس سے پوچھیں گے کہ اے فلاں! یہ تیرا کیا حال ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور بُرائی سے منع نہیں کرتا تھا۔

وہ جواب میں کہے گا، میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا مگر خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔
اور تمہیں برائی سے روکتا تھا لیکن خود اس برائی سے نہیں رکتا تھا۔

حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ نے اس آدمی کا عبرتناک حال بیان فرمایا ہے جو لوگوں کو تو نیکی کی تبلیغ کرتا تھا مگر خود اس نیکی پر عامل نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو تو برائیوں سے منع کرتا تھا مگر خود انہی برائیوں میں مبتلا تھا۔ ایسے شخص کے بارے میں سرکارؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا اور دوزخ میں اس کی پیٹ کی آنتیں اس کی دُبر سے باہر نکل آئیں گی اور وہ ان آنتوں کے گرد اس طرح چکر لگائے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے۔ جو لوگ دوزخ میں جل رہے ہوں گے، اس کے آس پاس جمع ہوں گے تو بہت سے لوگ اسے پہچان لیں گے اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کریں گے کہ تُو تو ہمیں نیکی کی تبلیغ کیا کرتا تھا اور بُرائی سے روکتا تھا۔ ہم تیرے کہے پر نہ چلے اور دوزخ ہمارا مقدر بنا مگر تو یہاں کیسے؟ اس پر اسے حقیقت کہے بغیر نہ بنے گی کہ میں تمہیں تو نیکی کا حکم دیتا تھا اور گناہوں سے روکتا تھا مگر خود عمل نہیں کرتا تھا۔ تم میں سے کچھ تو میری بات پر صدقِ صدیقین بھی نہ رکھتے ہوں گے مگر مجھے تو اچھی طرح معلوم تھا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ میں تو اسلام کے احکام سے واقف تھا اور جانتے بوجھتے ہوئے یہ حرکت کرتا رہا کہ تمہیں نیکی کا حکم دیتا اور بُرائی سے روکتا تھا مگر خود اس پر عمل پیرا نہ ہوتا تھا۔

قرآنِ مجید میں خداوند تعالیٰ کا واضح حکم ہے "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ"۔ جو کچھ تم کرتے نہیں، وہ اگر کہتے ہو تو خدا کے صریح حکم کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتے ہو۔ اسلام نے ہمیں گفتار و کردار میں یکسانیت اور ہم آہنگی کی ہدایت کی ہے۔ اقوال و افعال میں بُعد منافقت ہے اور

جو بزعمِ خویش خدا تعالیٰ کے نائب بنے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر ایسے آدمی کو فوراً فتووں کی سان پر کس دینا "حمیتِ دینی" کا تقاضا سمجھتے ہیں جس سے ذرا سی کوتاہی ہو جائے۔ آپ نماز میں کوتاہی کے مرتکب ہوں تو آپ کو حدیث "مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ" سنا دیتے ہیں۔ اگر آپ نے داڑھی منڈوا رکھی ہے، پھر تو ان کا روئے سخن آپ کی طرف ہو ہی ہو۔

مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اَكْثَرَ مُنَافِقِيْ اُمَّتِيْ قُرَّاؤُهَا (میری اُمت کے منافقوں کی بڑی تعداد وہ ہے جو قرآن پڑھنے والے ہیں)۔

ایسے عالمانِ دین اور مبلغانِ اسلام میں سے اکثر کا اپنا یہ حال ہے کہ جہاں ان کے مقتدی انہیں دیکھ نہ رہے ہوں، وہاں یہ نماز نہیں پڑھتے۔ جہاں انہیں اپنے جیسے "بے نمازوں" کی کمپنی میسر آ جائے اور ان پر یہ گمان نہ ہو کہ ان کے مقتدیوں میں کوئی ان کی اس حرکت کی تشہیر کر دے گا، یہ خود نماز کا اہتمام نہیں کرتے۔ میں ایک ایسے دیندار اور پارسا عالمِ دین سے واقف ہوں، جو اپنے "اتقا" کے باعث جلسوں میں کھنچنے والی تصاویر کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے ایک دو بار ایسے موقعوں پر انہیں اپنے چہرے کے سامنے کپڑا کرتے یا بازو پھیلاتے دیکھا ہے۔ ایسے ایک موقع کی تصویر خود میرے پاس بھی موجود ہے۔ لیکن ایک ایسے مقام پر جو اُن کی جائے قیام سے دور تھا، انہیں مختلف پوزوں میں بخوشی تصاویر کھنچواتے دیکھا ہے۔

ایسے علما سے تو آپ بھی واقف ہوں گے جو لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے سخت خلاف تھے۔ اس موضوع پر معرکۃ الآرا بحثیں ہوئیں۔ اور اب وہی علماء آلہ مکبر الصوت کے بغیر تقریر کرنا "گناہ کبیرہ" سمجھتے ہیں، اگرچہ ان کی تقریر سننے والے

پچیس آدمی اور پندرہ بچے بھی نہ ہوں۔

تصویر ہی کو لے لیجیے۔ کتنے عالمانِ دین ہیں جو اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں اور ان میں سے کتنے ہیں جو خود تصویر نہیں کھنچواتے۔ یا جلسہ کرانے کے بعد تصویریں کھنچوا کر، ان کے کئی کئی پازیٹو بنوا کر اخبارات میں انہیں چھپوانے کے لیے مارے مارے نہیں پھرتے۔

میں ایک ایسے خطیب کو جانتا ہوں جو ایک عرصے تک ریڈیو اور اس کی نشریات کے خلاف تقریریں کرتے رہے۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ انہیں گھر والوں کی پیہم فرمائشوں کے پیشِ نظر خود بھی ریڈیو خریدنا پڑا۔ پھر اہلِ محلہ نے دیکھا کہ ان کے گھر سے گانوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور ہر جمعے کے خطبے کا رُخ ٹی وی جیسی واہیات شے کی طرف مڑ گیا۔ وہ خطیب ایک عرصے سے ایک ہی مسجد میں ہیں اور محلے والوں اور ان میں خاموش سمجھوتا یوں ہو گیا ہے کہ ایک صاحب دل نے انہیں ایک ٹی وی سیٹ پیش کر دیا ہے اور انہوں نے اپنی تقریر "وی سی آر" کی "بدمعاشیوں" کی سمت پھیر دی ہے۔ اب محلے والے سمجھ گئے ہیں کہ مولوی صاحب کو "وی سی آر" چاہیے۔ اگر اس کا انتظام ہو گیا تو جو مزید چیز مولوی صاحب کو درکار ہو گی، اس کے خلاف تقاریر کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

لیکن کیا ہم اور ایسے مولوی صاحب قیامت کے حساب کتاب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو سرکارؐ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ قیامت کو ہمارا حال کیا ہو گا۔

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نبیوں کی اُمتوں کے متعلق فرمایا کہ ان کے حواری اور اصحاب ایسے ہوتے تھے جو ان کے طریقے پر چلتے تھے اور ان کی

خدا و رسولِ خدا (جل وعلیٰ و صلی اللہ علیہ وسلم) نے منافقت کو سب سے بڑا جرم اور گناہ قرار دیا ہے۔ جو شخص کہنے اور کرنے کی دو عملی کا شکار ہو، اس کا اسلام مشکوک ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، ہم من حیث القوم اپنے اعمال میں اُس سے مختلف ہیں جو ہم اپنے کردار میں نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اپنے بچوں کو جھوٹ نہ بولنے کی تلقین کرتے کرتے انہیں جھوٹ بولنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ باہر کوئی شخص مجھ سے ملنے آیا، میں اس سے ملنا گوارا نہیں کرتا، یا مجھے اس کا قرض دینا ہے یا وہ مجھ سے قرض مانگنے آیا ہو گا یا کسی اور وجہ سے میں اس کا سامنا کرنے سے کتراتا ہوں تو اپنے بچے کو حکم دوں گا کہ وہ باہر جا کر شخصِ مذکور سے کہے کہ ابا گھر پر نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ پورے معاشرے پر نظر دوڑائیے۔ اتنی دور جانے کی بھی کیا ضرورت ہے، صرف اپنے گریبان ہی میں جھانک لیجیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ دن میں کئی بار آپ جو کچھ کہتے ہیں، خود آپ کا عمل اس کے مطابق نہیں ہوتا۔
——— اگر واقعی یہ گمان درست ہو تو نبی نذیر آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محولہ بالا حدیث پاک پڑھیے اور اپنے عمل پر نظرِ ثانی کیجیے۔

ہم، اسلام کے نام لیواؤں کی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے مسلمان ہونے پر مفتخر بھی ہوتے ہیں، خدا اور رسولؐ سے محبت کے دعویدار بھی ہیں۔ بظاہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل نظر بھی آتے ہیں لیکن عملی اعتبار سے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے جو مومن کے لیے ضروری ہے۔ اس بدبختی کی انتہا یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ دین کی تبلیغ کو شعار کیے ہوئے ہیں، صبح و مسا جن کی زبانوں پر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردان ہوتی ہے، علمِ دین جن کا اوڑھنا بچھونا نظر آتا ہے

پیروی کرتے تھے مگر بعد میں ان کے نالائق جانشین ایسے بھی ہوتے تھے کہ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ (جو خود نہیں کرتے تھے اس کے لیے کہتے تھے اور جن کاموں کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ کرتے تھے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسوں کے خلاف جس نے اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا، وہ بھی صاحبِ ایمان ہے اور جس نے صرف زبان سے جہاد کیا، وہ بھی صاحبِ ایمان ہے اور جس نے صرف دل ہی میں ان کے خلاف جہاد کیا، وہ بھی مومن ہے لیکن جس نے اتنا بھی نہ کیا، اس کے صاحبِ ایمان ہونے کا کیا سوال؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس کے بغیر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ ایک تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ نیکی کا حکم دیں تو خود پہلے اس پر عمل کریں۔

در محبت آنچہ می گویم اوّل مے کنم
پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما

اور برائی سے روکیں تو پہلے خود اس برائی کے قریب نہ جانے کی قسم کھالیں۔ لیکن ہر مسلمان کے لیے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ گفتار و کردار کی دو عملی میں مبتلا ہونے والے ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کرے۔ اگر ہمارا ایمان پختہ ہے تو اپنے دست و بازو سے ان کے خلاف جہاد کریں۔ اگر ہمارا ایمان اتنا کامل نہ ہو تو زبان سے تو ان کے خلاف ضرور کہیں اور اگر ایمان زیادہ کمزور ہو تو دل میں تو ان کے خلاف نفرت رکھیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اتنا بھی نہ کیا، اس میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کہنے اور کرنے کی دو عملی سے بچائے اور اس گناہ کے مرتکبین کے خلاف جہاد کی توفیق بخشے آمین۔

مصنّف کی دیگر کتابیں

ورفعنالک ذکرک (اردو مجموعۂ نعت)

حدیثِ شوق (اردو مجموعۂ نعت)

نعتاں دی اَٹی (پنجابی مجموعۂ نعت)

تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰ء ——— ایک تاریخ، ایک تجزیہ

اقبال، قائداعظم اور پاکستان

قائداعظم ——— افکار و کردار

اقبال و احمد رضا ——— مدحت گرانِ پیغمبر

ماں باپ کے حقوق

راج دُلارے (بچوں کے لیے نظمیں)

مدحِ رسولؐ (انتخابِ نعت)

نعتِ خاتم المرسلینؐ (انتخابِ نعت)

نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب (تالیف و ترجمہ)

ترجمہ خصائص الکبریٰ

ترجمہ فتوح الغیب

ترجمہ تعبیر الرؤیا

اردو نعت ——— تاریخ و تجزیہ (زیرِ طبع)

تحریکِ ترکِ موالات (")